N.B.A.N.M.'s High School (Main)
LIBRARY

849 U

اور آنکھوں سے ٹپک کر دامن تک پہنچ گیا۔ یقیناً فنا بھی ہو سکتا ہے۔

سلطان :۔ ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے خاتون۔

عورت :۔ عالم پناہ! میں بھی اس جشن فتح میں سرخروئی کے ساتھ حاضر ہوئی ہوں۔ مگر نذر عقیدت پیش کرنے کے لیئے میرے پاس وہ آنسو بھی ہیں جو یہ ابھی پیش کر چکا ہے۔

سلطان :۔ اپنے بیان کو واضح کرو خاتون۔

عورت :۔ عالم پناہ! حق و باطل کی اس جنگ میں میرا بھی حصہ ہے سلطان کی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی میرا سردار بھی تھا۔ میں نے اس جنگ کے لیئے اپنا سہاگ پیش کیا تھا۔ میرا بہادر شوہر دشمن سے لڑا اور اسی طرح لڑا کہ سینے پر برچھی کھائی۔ جہاں پناہ میں سرخرو ہوں کہ میرے شوہر کی پشت پر زخم نہیں آیا۔ میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ پہلے میں ایک سپاہی کی بیوی تھی۔ اور آج میں ایک زندہ جاوید بہادر شہید کی بیوہ ہوں۔ عالم پناہ میں نے اپنے شوہر کی موت ان تمام آنسوؤں کو پی لیا جو دل سے امنڈ کر آنکھوں تک آنا چاہتے تھے۔ عالم پناہ! میرا شوہر عزم و ثبات کا کوہ گراں تھا۔ میں اس کی بیوہ ہوں۔ صبر و تحمل سے میں اس کی قربانی میں روح پھونکنا چاہتی ہوں۔ میری طرف سے نذر عقیدت یہ خشک آنکھیں ہیں۔ جن میں کوئی آنسو نہیں۔

سلطان :۔ زندہ باد خاتون۔ تمہارا سلطان خود خراج دینے کو تیار ہے۔ وہ قوم فنا ہو ہی نہیں سکتی۔ جس کی ایک خاتون ہفت اقلیم کے خزانوں سے زیادہ قیمتی یہ جذبات رکھتی ہو۔ وزیر اعظم۔ دربار برخواست کر دو۔ اس نذر سے زیادہ قیمتی نذرانہ انسانی تصور میں آسکتا ہے۔ اور نہ امکان میں۔ جشن فتح کا حاصل یہی پیکر صبر ہے اور یہی دو خشک آنکھیں۔

"دو خشک آنکھیں"

P.B.A.N.M's High School (Main) LIBRARY
ACC. No.
CLASS No.
Date

بڈھا :۔ جہاں پناہ کا اقبال بلند ہو۔
سلطان :۔ کیوں آنا چاہتے تھے۔ تم بڑے میاں اس دربار میں۔
بڈھا :۔ عالم پناہ! اس جشن فتح میں میرا بھی بہت بڑا حصہ ہے۔ میرے دل میں بھی اپنے سلطان کیلئے عقیدت ہے میں نے بھی اپنے لعل و جواہر اسی تخت اور اسی تاج کیلئے لٹائے ہیں۔ مگر آج بھی نذر دینے کیلئے میرے پاس ایک ایسا موتی ہے جس کا جواب شہنشاہ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ شاہی خزانے میں بھی نہ ہو۔
وزیر اعظم :۔ پاگل ہے جہاں پناہ۔
سلطان :۔ ٹھہرو۔ بڑے میاں ہم تمہاری بات کو سمجھنا چاہتے ہیں۔
بڈھا :۔ عالم پناہ میرے دو بیٹے سکندر اور صفدر میری زندگی بھر کی کمائی ہے وہی میرے لعل و جواہر تھے۔ میری دنیا کے آفتاب و ماہتاب وہی تھے۔ وہ اسی جنگ میں شریک ہوئے، جس میں حق کو آخری فتح اور باطل کو بالآخر شکست ہوئی۔ مگر آج وہ اس جشن فتح میں شریک ہونے کے لئے باقی نہیں ہیں۔ وہ شہید ہو چکے ہیں۔ میرا خزانہ لٹ چکا ہے مگر آج بھی میرے پاس ایک موتی ہے اس تاج کے موتیوں سے بھی آبدار موتی۔
سلطان :۔ اس موتی کو ہم اب بھی نہیں سمجھے بڑے میاں۔
بڈھا :۔ عالم پناہ وہ موتی ہے اولاد کا داغ کھانے والے اس باپ کا آنسو جس نے اپنے بیٹوں کو فرض پر قربان کر دیا اور آج ایک سرخرو کی حیثیت سے دربار میں اپنے شہنشاہ کے لئے اسی آنسو کو نذر عقیدت کے طور پر لایا ہے۔
سلطان :۔ ٹھہرو بڑے میاں، میں تمہاری اس نذر عقیدت کو قبول کرنے کا اہل نہیں اتنا قیمتی موتی۔ جس کا مول کرنے کیلئے میرا خزانہ بھی ناکافی ہے۔ میری حیثیت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس موتی کو مجھے نہ دو یہ موتی مورخ کے سپرد کرو تاکہ میرے عہد کی تاریخ جگمگا اٹھے۔ میرا تخت تاج اور میرا خزانہ فانی ہے۔ مگر یہ آنسو فانی نہیں۔
ایک عورت :۔ عالم پناہ۔
سلطان :۔ میرا کلام قطع کرنے کی جرأت کس نے کی۔
عورت :۔ میں نے عالم پناہ۔ اور اس لئے ظل اللہ کہ یہ آنسو بھی فانی ہے اس کے قیمتی ہونے کا انکار نہیں مگر وہ آنسو جو دل سے اُمنڈ کر آنکھوں تک آگیا اور

وزیر اعظم :۔ کمانڈر آصف خان

سلطان :۔ آصف خان۔ آگے بڑھو۔ یہ کیا لائے ہو سر

آصف خان :۔ دشمن کے سپہ سالار کی وہ تلوار جو اس نمک خوار نے جہاں پناہ کے اقبال سے ایک نبی وار میں چھین لی تھی۔ یہ تلوار جہاں پناہ کے اسلحہ خانے کی زینت ہوگی۔

سلطان :۔ تمہاری اس عقیدت کا شکریہ، تمہاری اس جوانمردی کا صلہ خود یہ تلوار ہے شاہی اسلحہ خانہ ایک شکست خوردہ سپہ سالار کی تلوار سے مزین نہیں ہو سکتا آصف خان یہ تلوار اعتراف شکست ہے۔ تم اسکو اپنی زور آزمائی کی سند کے طور پر ہماری طرف سے قبول کرو۔

وزیر اعظم :۔ صوبیدار معظم خان۔

سلطان :۔ معظم خان تم نے جس شجاعت کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ بہادری کی داد دینے کے لئے اس زبان میں ایک لفظ بھی نہیں جو میں بول اور سمجھ سکتا ہوں۔ یہ کیا لائے ہو۔

معظم خان :۔ وہ تیر جہاں پناہ جو میری کمان سے نکل کر سپہ سالار کے سینے میں پیوست ہوا تھا۔

سلطان :۔ یہ تیر اپنا کام کر چکا ہے معظم خاں مجھ کو تو اب ان تیروں کی ضرورت ہے جن کا کام ابھی باقی ہے البتہ اس تیر کو تم اپنے اسلحہ خانے میں رکھو تا کہ تمہارے بچے دیکھ سکیں کہ جس باپ کی وہ اولاد ہیں اس کی تیر اندازی کیا درجہ رکھتی تھی۔ اور اس کے تیروں کی پہنچ کہاں کہاں تھی۔

(دور سے شور کی آواز)

بڈھا :۔ مجھ کو جانے دو۔ میں ضرور جاؤں گا۔ مجھ کو نہ روکو۔ نہ روکو مجھ کو۔

سلطان :۔ یہ کیا شور ہے۔

وزیر اعظم :۔ عالم پناہ ایک دیوانہ بڈھا اپنے بوسیدہ کپڑوں کے ساتھ ایوان دربار کے صدر دروازے پر بضد ہے کہ پہرہ دار اس کو نہ روکیں اور وہ بھی باریاب ہو سکے۔

سلطان :۔ اس کو آنے دو۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور بھی آنا چاہے تو نہ روکا جائے۔ یہ فتح نصرت صرف ہاتھ میں تلوار لینے والوں ہی کی نہیں بلکہ دعا کے لئے اٹھنے والے ہاتھ کی بھی فتح ہے۔

شوکت تھانوی

شوکت کا نام محمد عمر اور وطن تھانہ ہے۔ اردو کے ممتاز اور زندہ دل ادیب ہیں۔ وہ بھوپال میں پولیس کے ایک اعلیٰ افسر تھے۔ آپ اس کثرت سے اپنی تصانیف ملک کے سامنے پیش کر چکے ہیں کہ شاید ہی کوئی اردو داں ہوگا، جس نے آپ کی کتابیں نہ پڑھی ہوں۔ اور ان سے لطف نہ اٹھایا ہو۔

شوکت کا شمار ظرافت نگاروں میں ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ افسانہ "دربار" ان کی سنجیدہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ دو خشک آنکھوں کو قیمتی نذرانہ اور پیکر صبر کو جشن فتح کا حاصل قرار دینا بڑی گہری بات ہے اس افسانہ کے پیش نظر یہ قول بالکل درست ہے کہ "یہ (شوکت تھانوی جس بلا کا مزاح نگار اور بزلہ سنج ہے۔ اسی غضب کا سنجیدہ انسان بھی ہے"

دربار

(نقیب کی آواز بلند ہوتی ہے)

نقیب :۔ باادب باملاحظہ ہوشیار! باادب باملاحظہ ہوشیار!! باادب باملاحظہ ہوشیار!!!

سلطان :۔ وزیر اعظم دربار فتح کے افتتاح کا اعلان کرو۔

وزیر اعظم :۔ عالم پناہ، ظل اللہ اعلیحضرت سلطان المعظم خلد اللہ ملکہ کہ دولت کے حکم خسروانہ دربار فتح کا آغاز ہوتا ہے۔ وفا داران حکومت نذر عقیدت کے مضطرب ہیں۔ عالم پناہ۔

سلطان :۔ دشمنان اسلام پر حق و صداقت کی فتح کا راز یہی عقیدت اور یہی وفا شعاری ہے۔ ہم بصد احترام اپنے جانبازوں کی نذر قبول کریں گے سب کے بعد دیگر پیش کئے جائیں۔

فقیر نے لاپرواہی سے جواب دیا :۔ ——— "ایک کاغذ اور قلم"۔
سلطان کے حکم پر یہ دونوں چیزیں آگئیں۔ فقیر نے کاغذ پر کچھ لکھا اور لپیٹ کر دوسری جانب پھینکتے ہوئے کہا :۔ ——— "اب آپ جو چاہیں کریں"۔

سلطان کا وہ ہاتھ جس میں چاقو تھا، بلند ہوا اور نہایت زور کے ساتھ پرندے پر اترا، پرندہ جان کے خوف سے بہت زیادہ پھڑ پھڑانے لگا۔ اس کشمکش میں گرفت ڈھیلی پڑ گئی، پرندہ ہاتھ سے چھوٹ کر اڑ گیا۔ اور چاقو سلطان کے ہاتھ پر اترا، ہاتھ سے خون بہنے لگا۔ پرندہ آزاد ہوتے ہی کمرے میں ایک دو چکر لگا کر دریچہ سے باہر اڑ گیا۔

باڈی گارڈ کا افسر سلطان کے اس زخم کو دیکھ کر گھبرایا۔ اور فوراً جا کر شاہی طبیب کو لے آیا۔ سلطان نے نہایت اطمینان سے اسکی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے حکم دیا کہ کاغذ اٹھایا جائے۔

کاغذ میں لکھا ہوا تھا :۔

"تم اس پرندے کی جان نہیں لے سکتے۔ خدا کی یہ مخلوق بھی اسی طرح آزاد ہے جس طرح تم آزاد ہو، اس کے چوٹ بھی نہ آئیگی لیکن تم خود نقصان اٹھاؤ گے۔

سلطان سراپا حیرت بن گیا۔ ابھی اس کی حیرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ فقیر اٹھ کر چلنے لگا۔ سلطان بھی ساتھ ہی اٹھا اور نہایت منت سے کہنے لگا۔

"سائیں جی! کچھ میری قسمت بھی بتا دیجئے"۔

فقیر پلٹا اور کہنے لگا :۔

شہنشاہ کی قسمت؟ وہ اس قالین پر نقش ہے"۔

نجومی کی پیشین گوئی جس طرح حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور سلطان کی شہادت سے ہندوستان کی قسمت کس طرح بدل گئی۔ اس سے آج ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے"۔ ——— "انقلابات ہیں زمانے کے"

——— (ختم شد) ———

کتبہ محمد عبدالغنی

حیرت سے فقیر کو دیکھنے لگے۔

سلطان اسی صوفہ پر بیٹھ گیا جس پر فقیر بیٹھا تھا سلطان نے کہا۔

"سلطنتِ خداداد کی ساخت میں آپ نے کیا دیکھا؟"

فقیر:۔ "رعایا نہایت خوش وخرم ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں میں سگے بھائیوں کی سی محبت ہے۔"

فقیر یہاں رُک گیا اور سلطان کے چہرے کو دیکھا جو خوشی سے چمک رہا تھا۔

فقیر نے پہلو بدلا اور کہنے لگا۔

"اگر شہنشاہ کی عدل گستری اور ہندو مسلمان کے ساتھ یہی یکسانیت کا سلوک رہا تو شہنشاہ کا پرچم اقبال تمام ہند پر لہراتا نظر آئیگا۔ خدا ایسے عادل و رحم دل شہنشاہ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ اور اس کا سایۂ عاطفت ہم جیسے فقیروں پر ہمیشہ قائم رکھے۔

فقیر کی گفتگو میں خوشامد کا پہلو تھا۔ فقیر کی نظر دوبارہ شہنشاہ کے چہرے کی طرف اُٹھی۔ اس وقت وہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ اسی حالت میں سلطان نے کہا:۔

"علم نجوم کے متعلق کچھ کہیئے، کیا یہ علم صحیح ہے؟"

فقیر:۔ "صحیح اور بالکل صحیح ہے لیکن صرف جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ دھوکہ بازوں نے اپنے فائدہ کے لئے اس کو بدنام کر رکھا ہے۔"

سلطان نے اپنے باڈی گارڈ کے افسر کی طرف دیکھا اور وہ باہر چلا گیا۔ سلطان اور فقیر دونوں خاموش تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی افسر ایک طلائی پنجرہ لے کر آیا جس میں ایک طوطا بند تھا۔ افسر کے پیچھے پیچھے ایک سپاہی چاقو لئے ہوئے تھا

سلطان نے پنجرہ کا دروازہ کھول کر پرندے کو اس طرح ہاتھ میں پکڑ لیا کہ اس کی دونوں ٹانگیں سلطان کی مٹھی میں تھیں اور پر کھلے ہوئے۔ طوطا پھڑ پھڑانے لگا۔ سلطان نے سپاہی کے ہاتھ سے چاقو لیتے ہوئے بخوبی سے کہا:۔ "بتاؤ۔ اس طوطے کی قسمت میں کیا ہے؟"

فقیر خاموش کھڑا تھا۔ بوڑھا باپ پھر ایک بار اس کے قدموں پر جھک گیا۔

"آہ! مہاراج۔ یہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی قسمت کو بدل دیجئے"

فقیر کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ اس نے حقارت سے کہا۔

"دیوانے! قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتا۔ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ بوڑھا اور ذلیل ہو کر کتے کی زندگی بسر کرنے سے ہزار درجے بہتر ہے کہ نامردی پیدا کر کے عین جوانی میں مر جائے"

یہ کہتے ہوئے فقیر راجہ خان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

سلطانی محل کے ایک وسیع کمرے میں ایک خوش نما قالین کے کنارے ایک نہایت آرام دہ صوفہ پڑا ہوا تھا۔ فقیر آتے ہی اس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ شاہی خدام فقیر کی اس بیباکی پر متحیر اور دم بخود تھے۔ کسی کو جرأت نہ تھی کہ فقیر سے کچھ بولے، تھوڑی دیر کے بعد شہنشاہ کمرے میں داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے باڈی گارڈ کے افسر تھے۔ سلطان کے اندر داخل ہوتے ہی خدام جھک کر آداب بجا لائے اور اشارہ پا کر باہر چلے گئے۔ فقیر اسی طرح بیٹھا رہا۔ اور اسکی نظر قالین پر جمی ہوئی تھی۔ وہ حیرت سے اسکے نقش و نگار اور گل بوٹے دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے ایسا قیمتی قالین عمر بھر نہیں دیکھا تھا۔ فقیر کا ایک پاؤں ٹخنوں تک قالین میں دھنسا ہوا تھا۔ قالین پر ایک نہایت خوبصورت جھاڑی بنی ہوئی تھی جس میں گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ جھاڑی کے کنارے ایک زبردست شیر آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ جھاڑی کے پیچھے پتوں میں چھپا ہوا ایک شکاری بندوق ہاتھ میں لئے ہوئے شیر کو تاک رہا تھا۔ شکاری کے سر پر فرنگی ٹوپی تھی۔ شیر اس سے بالکل بے پروا تھا۔ اس نظارے پر فقیر کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں کہ سلطان بالکل قریب آ گیا۔ فقیر کی نظر اٹھی اور اس نے اٹھتے ہوئے کہا کہ "آیئے" "بیٹھئے" گویا یہ اس کا خاص کمرہ ہے۔ سلطان کے باڈی گارڈ کے افسر

"شہنشاہ نے مجھے محل میں فوراً آنے کے لئے کہا ہے۔
نجومی کو اس بیجا دخل دہی پر غصہ آگیا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے راجہ خان کی طرف دیکھا اور کہا۔
"شہنشاہ سے جاکر کہو کہ فقیر بھی اپنے دل کا مالک ہے۔"
راجہ خان کا سارا رعب، دبدبہ اور غرور خاک میں مل گیا۔ اس کو بیحد غصہ آیا لیکن اس وقت وہ مجبور تھا۔ اس لئے کہ جبر سے ہمیں فقیر بالکل برافروختہ نہ ہو جائے اور آنے سے صاف انکار کر دے، کچھ سوچ کر وہ فوراً گھوڑے سے اتر آیا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔
"بندہ حکم کا تابع ہے۔ شہنشاہ نے آپ کو طلب کیا تھا۔ تعمیل حکم میں دیر ہوگی تو شہنشاہ کی خفگی کا خوف ہے۔ بندہ پروری ہوگی۔ اگر آپ میرے ساتھ محل میں چلیں۔"
نجومی نے کہا:۔ ——— "اچھا ٹھہرو ابھی آتا ہوں۔"
یہ کہہ کر وہ لڑکے کا ہاتھ دیکھنے میں مصروف ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔
"بڑا خوش قسمت ہے۔ دنیا میں نام اور عزت پیدا کرے گا۔"
ان الفاظ کو سن کر لڑکے کا بوڑھا باپ بہت خوش ہوا۔ اور جھک کر فقیر کے پاؤں چومنے لگا۔ فقیر اسی طرح ہاتھ دیکھنے میں مصروف تھا۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے کہا:۔
ہاں عین جوانی میں میدان جنگ میں مارا جائے گا۔ اس کا نام پردیس میں ہوگا۔ یہاں اس کے نصیب میں کچھ نہیں۔"
وہی باپ جو ایک لمحہ پہلے خوشی میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اب تصویر حیرت بن گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے نہایت عاجزی سے کہا:۔
"مہاتما! ایسا نہ کہئے۔ پردیس کی عزت اور دولت سے بہتر ہے کہ یہ وطن میں فقیر ہو کر جیئے۔"
"مہاراج! تقدیر آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دعا کیجئے کہ اس کی عمر بڑی ہو۔"

دو افسر ہمیشہ سلطان کے ساتھ کچھ فاصلہ پر رہتے تھے۔

آٹھ بجے کا وقت ہے، شہنشاہ تفریح سے واپس ہو رہا تھا کہ اس سڑک پر جو رنگناتھ جی کے مندر سے ہوتی ہوئی محل کی جانب مڑتی تھی۔ اس کو چند آدمی نظر آئے جو ایک فقیر کو گھیرے کھڑے تھے سلطان نے مڑ کر دیکھا باڈی گارڈ کا ایک افسر گھوڑے کو ایڑ لگا کر بالکل قریب آگیا۔ سلطان نے اس سے دریافت کیا۔

"راجہ خاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

راجہ خاں "ظل اللہ! کوئی نجومی ہے جس کو لوگ ہاتھ دکھا رہے ہیں۔"

سلطان۔ "کیا تمہیں نجوم پر اعتقاد ہے؟"

راجہ خاں گھبرا گیا۔ اس سے جواب نہ بن سکا۔ اس کی نظریں نیچی ہو گئیں۔

سلطان نے ہلکی سی گرجدار آواز میں کہا۔

"جواب ——— ؟"

راجہ خاں ایک نومسلم تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ مسلمانوں کو نجوم پر اعتقاد نہیں یہ کیسے ممکن تھا کہ شریعت پناہ شہنشاہ کو نجوم پر اعتقاد ہو لیکن اس نے آہستہ آہستہ کہا۔

"نجوم ایک علم ہے اور اس کی حقیقت انہی لوگوں کو معلوم ہے جو اس میں مہارت رکھتے ہیں۔"

شہنشاہ کو اس غیر ذمہ دارانہ جواب پر ہنسی آگئی لیکن اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا

"اچھا اس نجومی کو محل میں پیش کیا جائے۔"

یہ کہتے ہوئے سلطان اپنے دوسرے باڈی گارڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

راجہ خاں نجومی کے پاس پہنچا۔ یہ ایک خستہ حال فقیر تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بانس کا عصا تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک لڑکے کا ہاتھ تھا جس کو وہ بغور دیکھ رہا تھا۔

راجہ خاں کے پہنچتے ہی لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ اس نے حکمانہ لہجے میں زور سے کہا:۔

محمود خان محمود

نجومی اور ٹیپو سلطان

۱۷۷۴ء کے مارچ کے مہینے کی ایک سہانی صبح ہے۔ عروس البلاد سرنگاپٹم کے در و دیوار آفتاب کی سنہری شعاعوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ رنگناتھ جی کے مندر کے عکس کے پہلو بہ پہلو قصر سلطانی بھی جگمگا کر ہندو مسلم اتحاد اور شہنشاہ ٹیپو سلطان کی رواداری کا روح پرور نظارہ پیش کر رہے ہیں یہ وہ دن تھے کہ سلطنت خداداد کا آفتاب اقبال جنوبی ہند پر اپنی پوری تابانی کے ساتھ ضوفگن تھا۔ شہنشاہ ٹیپو سلطان کا غلغلہ ہندوستان و ایشیا سے نکل کر یورپ تک پہنچ چکا تھا۔ ۱۷۷۸ء میں انگریزوں اور نواب حیدر علی کے درمیان جس جنگ کا آغاز ہوا تھا۔ اس کا اختتام ۱۷۸۲ء میں عہدنامہ منگلور پر ہوا۔ جس میں ٹیپو سلطان فاتح و منصور ہو کر نکلا۔ منگلور (کوڑیال بندر) کا محاصرہ اور اس کی فتح ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری پر ایک ایسی ضرب کاری تھی کہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ کانپ اٹھے، اور ان میں صف ماتم بچھ گئی اور انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ اس ملک سے ان کی تجارت کی امیدیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ ہاں تاریخ ہند کی چند ایسی ہستیاں تھیں۔ جنہوں نے اغیار کو اس ملک میں اس امید پر ٹھہرائے رکھا کہ جو چیز آج بزور شمشیر حاصل نہیں ہوئی۔ وہ کل غداروں اور سازشوں کے ذریعہ خود بخود مل جائے گی اس بھروسے پر ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس کی تجارت پر قناعت کر لی۔ اور بظاہر خاموش بیٹھ رہی۔

جنوب کے اس بادشاہ کا خاصہ تھا کہ صبح سویرے تلاوت قرآن اور نماز سے فارغ ہو کر تفریح کے لئے نکل جاتا تھا۔ ایسے موقعوں میں بادی گارڈ کے

محمود خان محمود بنگلوری

"تاریخ سلطنت خداداد" کے شہرۂ آفاق مصنف محمود خاں صاحب، محمود کا انتقال ۱۹۵۸ء میں بنگلور میں ہوا۔ ریاست میسور کے مشہور و معروف صحافی، ادیب اور مورخ تھے، جن کو ملک بھر میں بڑی عزت اور شہرت حاصل ہوئی۔ پہلے بنگلور کے اردو اخباروں کے لئے مضامین نظم و نثر لکھتے تھے۔ پھر نواب حیدر علی خاں بہادر اور ٹیپو سلطان شہیدؒ کی تاریخ لکھنے میں پوری طرح مشغول و مصروف ہو گئے، اور اسی موضوع پر تاریخ سلطنت خداداد ٹیپو سلطان، صحیفۂ ٹیپو سلطان وغیرہ قیمتی تصانیف اردو میں پیش کیں جو آپ کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گی۔ "اتفاقات ہیں زمانے کے" "اور انقلابات ہیں زمانے کے" آپ کے بڑے پر لطف تاریخی افسانوں کے مجموعے ہیں۔ تاریخ جنوبی ہند اور فیصلہ کن جنگیں دو اور تاریخی شاہکار ہیں۔ تاج نامی کتاب میں "تاج محل" کی تعمیر کی تحقیق درج کی ہے۔ اور مہندس کا دیوان ترتیب دیا ہے۔ آپ کی آخری تصنیف "ٹیپو سلطان" آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئی جو سلطانیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، بنجومی اور ٹیپو سلطان آپ کا ایک تاریخی افسانہ ہے جس میں آپ نے سلطان کے عہد اور حالات کی ایک جھلک پیش کی ہے۔

تیرے لئے ایک بیٹی لایا ہوں ..... اس کا خط پڑھ کر آج مجھے پھر اس عظیم درد اور مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ جیسے میں نے اپنے بیٹے کو پہلی بار جنم دیا ہو..... بس اب اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔!

تمہاری ماں

الیسنھر

پرویز بھی شام کے قریب لکھا ہوا خط پڑھ رہا تھا۔ خط پڑھتے پڑھتے اس کی انگلیاں سختی سے شام کے ہاتھ پر جم گئیں اور اس کے منہ سے نکلا۔ "موہنی!"

شام نے اپنا منہ موڑ لیا اور آنسو پونچھ کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے مینگو لیا کے سپید نیچے اپنے رخساروں سے لگائے۔ .....!"

رات خاموش تھی، پھول بھی خاموش تھے ..... صرف دور کہیں بہت دور شاید کوئی بلبل نغمہ ریز تھی۔

اور اس کے بغیر دُنیا میں کوئی انسانی سماج تادیر نہیں —
پنپ سکتا ..... وٹھل واڑی کی گھاٹی پر اسے
پہلی بار احساس ہوا کہ محبت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا —
کوئی ملک نہیں ہوتا، کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ زندگی
کا آخری اور ابدی آدرش ہے ..... جب وہ آسام
جا رہا تھا تو تمہیں یہ سب بتانا چاہتا تھا کہ وہ بس اس
محبت کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس محبت کے لئے جو آدمیت
سے پیدا ہوتی ہے — اس نفرت کے خلاف
جس کا منبع فسطائیت ہے ۔ .....
اس کا خیال تھا کہ جب وہ جنگ سے واپس
آئے گا۔ تو تمہیں بتائے گا۔ اپنے ہم وطنوں
کو بتائے گا۔ .....
لیکن اب اس کی لاش آسام کی کسی
گھاٹی کے سینے میں چھپی ہے۔ اور اس کے سر پر
موت کا صلیب ہے .....!
ہر ماں کو اپنے بیٹے کی موت کا دکھ ہوتا ہے اور
پھر میرا تو وہ ایک ہی بیٹا تھا۔ یہ مشیت ایزدی
تھی کہ وہ مجھ سے یوں چھن جائے۔ لیکن اس کا آخری
خط پڑھ کر مجھے معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ کہیں
کھو نہیں گیا۔ جیسے وہ اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے
اور مسکرا مسکرا کر مجھ سے کہہ رہا ہے، دیکھ ماں!

کے دوست ہو اس لئے میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں، ممکن ہے تم اپنی ماں کی کچھ مدد کر سکو۔ موبی نے مرنے سے پہلے اپنی وصیت میں تحریر کیا تھا کہ اس نے دھلی واڑی میں ایک لڑکی کو اپنی بہن مانا ہے۔ اس لڑکی کا نام "موہنی" ہے، موبی نے یہ بھی لکھا تھا کہ تم اس لڑکی کو اچھی طرح پہچانتے ہو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اب جبکہ موبی اس جہاں میں نہیں ہے تم میری بیٹی کو میرے پاس بھیجدو۔ اگر کسی وجہ سے ممکن نہ ہو تو بھی مجھے لکھو تاکہ میں خود ہندوستان آنے کا بندوبست کر سکوں، اگر زندگی نے ساتھ دیا تو میں ضرور آؤں گی۔ میں "موہنی" سے ملنا چاہتی ہوں۔ اگر ہو سکے تو اپنے ساتھ گھر لیجانا چاہتی ہوں کیا یہ ممکن نہیں ہے؟

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایک امریکی عورت کی اس تخیل پرستی کو غلط سمجھو اور اسے کوری جذباتیت پر محمول کرو لیکن یہ کوری جذباتیت ہے نہ محض تخیل پرستی یہ ایک خوبصورت حقیقت کا مشاہدہ ہے۔ جسے میرے بیٹے نے اپنا خون دے کر حاصل کیا ہے ..... وہ میرا اکلوتا لڑکا تھا۔

اپنے آخری خط میں اس نے لکھا ہے کہ جس روز موہنی نے اس کے ٹخنوں سے زہر چوس لیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ گویا "موہنی" نے یہ زہر اس کے جسم سے نہیں اس کی روح سے چوس کر باہر نکال دیا ہے۔ وہ زہر جو کالے کو گورے سے، غریب کو امیر سے اور آدمی کو آدمی سے جدا رکھتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ محبت ہر خوبصورتی انسانی [illegible] کی پہلی اور آخری شرط ہے اور

ماں کے سپید بالوں کی طرح مقدس ہیں۔ موبی نے گلدان سے مینگولیا کے سپید غنچوں کو چھوا، ہلکے آہستہ ملائم انداز میں جیسے وہ ان سے پیار کر رہا ہو۔

پرکاش سسکیاں لینے لگا۔

موبی نے کہا "شام میں سچ کہتا ہوں، میں پرل ہاربر کے لئے نہیں لڑ رہا" وہ سوچنے لگا "میں ــــ شاید ــــ ان سپید غنچوں کیلئے لڑ رہا ہوں"

اور موبی نے منگولیا کے سپید پھول اپنے رخساروں سے لگا لئے۔

سب خاموش تھے، رات بھی خاموش تھی، بیئر کا کف باقی تھا۔

اور دور کہیں بہت دور شاید کسی بلبل کا نغمہ گونج رہا تھا.....!

کئی ماہ گذر گئے۔ موبی کا کوئی خط نہ آیا۔ شاید سنسر۔

پرکاش بخیریت تھا۔

پھر پتہ چلا کہ پرکاش جاپانیوں کے خلاف لڑتے لڑتے مارا گیا

پھر بھی موبی کا کوئی خط نہ آیا

پرویز نے کہا "ان امریکنوں کا کیا اعتبار؟ یہاں پر کیسی رفاقت جتاتا تھا اور وہاں جا کر....." اس نے سگریٹ کی راکھ ٹاک دان میں پھینک کر اپنی دانست میں موبی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا۔

چند ہفتے ممتاز کی نگاہیں کھوئی کھوئی سی رہیں، پھر وہ بھی بھول گئی، پھر شام ٹائیفائڈ میں مبتلا ہو گیا۔ علالت کے دوران میں اسے ایک سنسر شدہ خط ملا۔ یہ اوہی او سے آیا تھا۔ خط کھولتے کھولتے شام نے سوچا بد معاش واپس اوہی او پہنچ گیا ہے۔ اور ــــ خط کی عبارت یہ تھی:

پیارے بیٹے!

میں تمہیں اپنا بیٹا کہہ رہی ہوں، کیونکہ تم میرے موبی

متعلق بہت سی بری باتیں سنیں اور ان پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔ شمی تمہیں وہ تحفے تحائف والی بات یاد ہوگی..... تم مجھے کمینہ سمجھو گے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کے دن تک تمہارے طرزِ عمل کو اسی کسوٹی پر پرکھتا رہا ہوں ..... مگر یہ کلیہ بھی غلط نکلا۔

"غلط کیسے"؟ شام نے کہا۔ "بھوتنی کے یہ بے بسط جو پلا رہے ہو، چالیس روپے کی تو یہ اکیلی بیئر ہوگی، اس پر بھی یہ کہتے ہو ہم مالی فائدہ حاصل نہیں کرتے۔ کیا بیئر سے اتنا نشہ ہو جاتا ہے تمہیں"؟

موبی مسکرایا کہنے لگا "میں سیاست نہیں جانتا ہوں، صرف دل دیکھتا ہوں، دل پہچانتا ہوں، میں نے تمہارے دلوں کو بھی اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا ہے..... جب میں واپس امریکا جاؤں گا تو۔

"تو کیا ہوگا"؟ پرویز نے پوچھا۔

موبی نے کہا "کچھ نہیں..... سنو، وہ ــــ شاید کہیں بلبل بول رہی ہے"۔

"بلبل بول رہی ہے؟ یہاں؟ موبی یہ تمہارا واہمہ ہے۔ یہاں مغربی گھاٹ پر بلبل نہیں بولتی" پرویز نے جواب دیا۔

قدرے توقف کے بعد موبی نے آہستہ سے کہا..... مگر بالکل وہی آواز ہے..... یہ نغمہ کہیں دور سے آیا ہے" اس کی آنکھیں خوابیدہ ہو گئیں۔

"نیویارک سے"؟ شام نے پوچھا۔

"ہاں نیویارک سے بھی آسکتا ہے جہاں میری محبوبہ رہتی ہے اور اوہی اور سے بھی جہاں میری رہتی ہے..... موبی یادوں میں کھو گیا..... یہ مینگرو لیا کے غنچے میری محبوبہ کے رخساروں کی طرح تازہ ہیں..... میری

پرویز نے کہا "فرنگی سے کیوں نہیں لڑتے! یہ بھی تو مخمل نہیں ریشم نہیں دیبا نہیں۔"

حمید نے کہا "غالباً پرکاش دو محاذ پر بیک وقت لڑنا نہیں چاہتا۔ ہٹلر کا حشر تم دیکھ چکے ہو۔"

سب ہنسنے لگے، موتی چپ تھا۔

شام نے کہا "بھوتنی کے تم نہیں بولو گے!؟"

موتی نے کہا "جہاں تک سیاست کا تعلق ہے میں خاموش رہونگا! جو ہدایات مجھے ملی ہیں۔ حتی الوسع ان کی پابندی کروں گا..... اتنا ضرور کہوں گا کہ جب میں آیا تو مجھے بہت سی ایسی باتیں کہی گئیں تھیں۔ جو ہندوستانی سماج کے متعلق تھیں، اور جو بعد میں مشاہدے سے اور تجربہ سے غلط ثابت ہوئیں، ممکن ہے آج میں ان باتوں کا یہاں اقرار نہ کرتا..... لیکن فرنٹ پر جا رہا ہوں"!

سب چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"مجھے بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی عورتیں بڑی ڈرپوک ہوتی ہیں۔ ..... وہ پردے میں رہتی ہیں اور سفید آدمی کے سائے بھی گھبراتی ہیں... ..... اب میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے..... وہ پردے میں بے شک رہتی ہیں وہ حیا پرور ہیں لیکن ڈرپوک نہیں، وہ تمہارے مردوں سے زیادہ دلیر ہیں..... وہ موت کا مقابلہ بھی کر سکتی ہیں، اگر ضرورت پڑے"!

حمید نے طنزاً کہا "موتی نہیں بول رہا ہے، سانپ کا زہر بول رہا ہے۔"

موتی نے کہا "ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کی بری باتیں سنے اور ان پر اعتبار کرے، یہ انسانی فطرت ہے۔ اسی طرح میں نے بھی تمہارے

سب ہنس پڑے، موبی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

پرکاش نے کہا: "آج مدت کے بعد بے بسٹ پینے کو ملی ہے، زبان ترس گئی تھی، اس ذائقہ کو"۔

حمید نے کہا: "شاباش! مرنے سے پہلے جی بھر کر پی لو"۔

پرکاش کہہ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہے.....

یہ جب میں ذہنی دورے پر آگیا تو سوچتا تھا کیا کروں؟ نہ فرنگی فسطائیت اچھی ہے نہ جاپانی پھر؟ کیا کروں؟ چپکا بیٹھا رہوں، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی کربناک موت کا شکار ہو رہا ہوں۔ اپنے ملک میں انگریزوں اور جاپانیوں کو لڑتا دیکھوں اپنے کھیتوں کو، اپنے گاؤں کو، اپنے شہروں کو اُجڑتا دیکھوں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں..... غلامی کے بعد بے حیائی اور ڈھٹائی کی منزل آتی ہے۔ اور اس منزل پر پہنچ کر ہر قوم مُردہ ہو جاتی ہے۔ غلامی سے آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم غلامی کی حدود سے گزر کر بے حیائی، ڈھٹائی اور بے عملی کا ثبوت دینے لگے۔ گو پھر وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتی، اسی لئے تو میں جاپانی فسطائیت کے خلاف لڑ کر اپنا خون بہا دینا چاہتا ہوں، میرا یہ اقدام فسطائیت کے سارے ظالمانہ نظام کے خلاف ہوگا۔ چاہے وہ دنیا کے کسی حصے میں کیوں نہ واقع ہو، چاہے ان کے اثرات بعض اتحادیوں میں ہی نمایاں کیوں نہ ہوں، میری موت میری لڑائی اس فسطائیت کو بھی ضرور کمزور کرے گی۔ جس کی ایک جھلک شاید ہمیں اپنے گھر میں بھی ملتی ہے.....!

پرکاش یکایک چپ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بیئر کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

جاپانیوں سے، جاپانی فسطائی ہیں۔ اس لئے انگریز اپنے ملک میں فسطائی تو ہوں۔ اس ملک میں تو اکثر اوقات ان کے طرز عمل کو فسطائیوں کے سلوک سے متمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے..... تو بتی سچ بتاؤ تم کیوں لڑنے جا رہے ہو، تم اپنی ماں کے اکلوتے بیٹے ہو تم ....."

سوبتی نے بے بسٹ بیئر کے آٹھ ڈبے جھولے سے نکال کر میز پر رکھ دیئے کہنے لگا "یہ بیئر میں نے اس دن کے لئے سنبھال کر رکھی تھی۔ آج وہ دن بھی آن پہنچا پیو!"

شام نے ڈبے میں چاقو سے سوراخ کیا اور بیئر کی دھار اُبل کر اس کے چہرے پر آ پڑی۔ پھر وہ جلدی سے یہ سنہری سیال گلاسوں میں انڈیلتا گیا۔ بیئر کا کف گلاسوں کے اوپر بڑھ رہا تھا۔ جس طرح ساحل کی ریت پر سمندر کا جھاگ اچھلتا ہے۔

شام نے پوچھا تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

پرکاش نے جذباتی لہجے میں کہا "مجھ سے پوچھو میں بتاتا ہوں، میں کیوں لڑنے جا رہا ہوں"؟

اس لئے کہ تم بے وقوف ہو، پیرویز نے کہا "انگریز ہندوستان دیگا نہ مسلمان کو پاکستان وہ دونوں کو بیوقوف بنا رہا ہے، جاہل کہیں کے!"

"کہنے دو اسے" ممتاز نے کہا۔ "اس کی بات بھی سن لینے دو" ممتاز کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

پرکاش نے تشکر آمیز نگاہوں سے ممتاز کی طرف دیکھا.....

"میں مرنے کیلئے جا رہا ہوں، اب واپس نہیں آؤں گا میں جاپانی فسطائیت کے خلاف اپنا خون بہانے جا رہا ہوں"

شام نے کہا "چپ رہو بھوتنی کے"۔
لڑکیاں جلدی جلدی آگے بڑھ گئیں، موبی وہیں دیر تک محوِ حیرت رہا۔
ہسپتال میں موبی سے ڈاکٹر نے کہا "اچھا ہوا اس کی نے زہر چوس کر اُگل دیا ورنہ تمہاری جان نہ بچتی"۔
"مگر میں نے تو سانپ کاٹنے کا انجکشن ہندوستان آتے ہی لے لیا تھا"۔
اس انجکشن میں اس سانپ کے زہر کا تریاق شامل نہیں۔ ڈاکٹر اس چھوٹے سے سانپ کے کچلے ہوئے سر کا معائنہ کرنے لگا۔ جاؤ اب..... تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں"۔
موبی کے لبوں پر ایک نام آیا "موہنی"!
"چپ رہو بھوتنی کے" شام نے کہا۔
پھر جب موبی شام کے گھر آیا تو جاپانیوں نے آسام پر حملہ کر دیا تھا۔
اور اُسے آسام جانے کا بلاوا آچکا تھا کل صبح وہ آسام جا رہا تھا۔
پرکاش بھی فوج میں داخل ہو گیا تھا وہ بھی کل ہی جا رہا تھا۔
محفل اداس تھی، ممتاز کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے، حمید آج سگریٹ کے بجائے سگار پی رہا تھا۔ عذرا بھی کی آنکھوں کی متانت اور بھی دبیز ہو گئی تھی وہ پتلیاں آج بے حد پُراسرار تھیں۔
موبی جو ہمیشہ چہکتا تھا آج خاموشی کی حد تک کم گو تھا۔
پرویز نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "تم تو پرل ہاربر کیلئے لڑ رہے ہو جو لیکن یہ پرکاش کیوں لڑ رہا ہے"۔
شام نے کہا "شاید آج میں بھی فوجی وردی پہنے ہوتا لیکن دل میں وہ ولولہ نہیں، وہ اُمنگ نہیں، وہ جوش نہیں، اپنی غلامی کا کس سے انتقام لیں۔

ایک دبلی پتلی سانولے رنگ کی لڑکی جھجکتے جھجکتے آگے بڑھی۔ اس نے گاگر سر سے اتار کر زمین پہ رکھدی۔ اور پھر آگے بڑھ کر غور سے اس چھوٹے زخم کے منہ کو دیکھنے لگی، جو ٹخنوں سے اوپر کی جلد کو سبز کرتا جا رہا تھا۔ پیشتر اس کے کہ کوئی سمجھے کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ اس زخم سے لگا دیئے اور زہر چوس کر تھوک دیا۔ ایک بار..... دو بار..... موبی نے اپنا پاؤں ہٹانا چاہا مگر اس لڑکی نے پاؤں چھوڑا نہیں۔ تیسری بار وہ اچھل کر پرے ہو گیا اور لڑکی کی گاگر الٹ گئی اور ٹھوکر کھا کر شور مچاتی ہوئی ڈھلوان کی جانب لڑھکتی گئی، لڑکی اپنی گاگر کی طرف بھاگی، ندی کے کنارے پہنچ کر اس نے اسے پھر پا لیا۔ وہاں اس نے پانی سے مکھیاں کیں ایک جڑی توڑ کر کھائی، بادلی سے پانی بھرا اور پھر گھاٹی پر چڑھنے لگی۔

یکایک موبی نے کہا "بات سنو"

لڑکی رک گئی اور چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارا نام"

لڑکی نے شرما کر منہ پرے کر لیا۔ دوسری لڑکی نے آہستہ سے کہا "موہنی" اس کا نام ہے مگر یہ گونگی ہے۔ وہ ہنسی اور موہنی کی نگاہیں زمین پہ جھک گئیں۔

"میں اس کے ماں باپ سے ملنا چاہتا ہوں" موبی نے کہا۔

"ایک لڑکی نے بتایا" اس کے ماں باپ مر چکے ہیں یہ اپنے چچا کے ہاں رہتی ہے۔

موبی نے شام سے کہا "مگر ــــ اس لڑکی کو فوراً میرے ساتھ ہسپتال لے چلنا چاہیئے"

چند لمحے خاموشی رہی، وہ اس جھاڑی کی طرف دیکھتے رہے اور گھاٹیوں میں لڑکیوں کا گیت گونجتا رہا۔

پھر جھاڑیوں کی اوٹ میں سے موبی کا سر بلند ہوا۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری، سانپ، سانپ اور وہ پھر اسی جھاڑی میں غائب ہو گیا۔ سب لوگ اس کی طرف لپکے پھر رک گئے، پھر بڑھے، پھر چیخنے لگے "سانپ! سانپ!"

پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی لڑکیوں کے قدم رک گئے۔ نغمہ بند ہو گیا وہ جلدی سے نیچے اتر آئیں۔

موبی نے سانپ کا سر کچل دیا تھا لیکن اس کا چہرہ سبز ہوتا جا رہا تھا۔ موبی نے کہا۔

سانپ نے..... مجھے..... کاٹ کھایا ہے ——— دیکھو!"

ٹانگ پر ——— ٹخنوں سے اوپر ——— جلد کا رنگ سبز ہوتا جا رہا تھا۔

شاہد نے چرمی فیتہ توڑ کر موبی کے گھٹنے کے اوپر کس کر باندھ دیا۔

ممتاز نے اپنا ڈوپٹہ شام کے ہاتھ میں دے دیا۔ پھر کہنے لگی۔

"پیاز کھلاؤ اسے پیاز اور بھاگی بھاگی آم کے پیڑ کے نیچے پڑے ہوئے سامان خورد و نوش میں سے پیاز ڈھونڈنے لگی۔

گاؤں کی ایک لڑکی بولی۔ "منگر یہ تو افعی ہے ہائے!"

حمید نے گھبرا کر کہا: "اگر اس وقت کہیں سے موٹر مل جاتی!"

پرکاش بولا: "موٹر اب تو شام کے سات بجے آئے گی۔"

گاؤں کی ایک اور لڑکی بولی: "منگر یہ تو افعی ہے یہ تو پانچ منٹ ہیں۔"

موبی کی حالت ہر لحظہ غیر ہو رہی تھی۔

پرکاش نے آہ بھر کر کہنے لگا۔ جب عورت مسکراتی ہے تو پھولوں پر شبنم چمکتی ہے۔ اور چشمے کا پانی گیت گانے لگتا ہے۔"

حمید نے کہا۔ "تو ہے بے تو، عورت کہیں نہیں ہے، یہ صرف مرد کا تخیل ہے۔"

عذرا بہن نے حمید کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا۔

لڑکیاں پیتل کی گاگریاں سر پر رکھے گھاٹی کے اوپر چڑھتی جا رہی تھیں۔ گھاٹی چڑھ کر ان کا گاؤں آتا تھا۔ گھاٹی کی پگڈنڈی مہندی کی لکیر تھی جس کی خاک سے کنواریاں سدا سہاگن ہوتی ہیں۔ وٹھل واڑی کا چشمہ امرت ہے۔ وٹھل واڑی کی زمین میں شکر گھلی ہوئی ہے۔ پھر وٹھل واڑی کے گنے اس قدر میٹھے کیوں نہ ہوں، پھر کنواریوں کے گلے میں رس کیوں نہ ہو۔

وٹھل واڑی کے گیت گاؤ۔ وٹھل واڑی پیشواؤں کا سب سے سندر گاؤں ہے۔"

پرکاش نے جب یہ گیت موتی کو سنایا تو وہ اچھل پڑا اور کہنے لگا۔ "شیمی اگر کوئی ہرج نہ ہو تو میں ان جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر اس پگڈنڈی پر چلتی ہوئی لڑکیوں کی تصویر میں لے لوں۔"

"کیوں؟" شام کا لہجہ شبہے سے خالی نہ تھا۔

ہم واٹر ورکس کے سماج میں رہتے ہیں بھائی۔" موتی نے جواب دیا۔ "تم نہیں جانتے میرے لئے یہ منظر کس قدر عجیب ہے۔"

شام نے اجازت دے دی، موتی نے کیمرہ درست کیا اور پھر آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ہو کر چلا۔ آخر کار وہ ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے غائب ہو گیا۔

اپنے بھائی بند ہی نظر آتے ہیں۔ یہ پیڑ، یہ سبزہ، یہ ندی، یہ مغربی چوٹیوں کے اُفق سے اُترتی ہوئی قطار جیسے کنواریاں سر پہ گھڑے لئے ہوئے کسی گھاٹ کے آغوش میں نیچے ندی کو جا رہی ہوں۔ یہ یروشلم ہے، یا وٹھل واڑی؟ مندر کا سنہری کلس اور اس کی آنکھوں میں چمکنے لگا۔ ترسول، صلیب ہی تو ہے!... ..... ہاں وہی تو ہے۔ یہ مندر جو ندی کے کنارے اپنے کھیت میں پل چلا رہا ہے۔ کیوں وہ اس منظر سے صدیوں سے واقف ہے؟ اور واقف ہو کر بھی آج تک ناواقف ہے۔ انسان اور زمین کی تصویر تو بہت سادہ ہے، اس میں سبزہ ہے اور پانی ہے اور ہل ہے اور شفق کا سونا ہے اور عبادت کے لئے ایک مندر ہے! اس معصوم تصویر میں کس لئے خونیں نقش و نگار اُبھارے جا رہے ہیں۔ کس لئے کس لئے...؟

یکایک پرویز نے کہا۔ "موہنی جب میں ندی کے کنارے اس مندر کو دیکھتا ہوں تو میرا جی بے اختیار عبادت کرنے کو چاہتا ہے"!

"کس کی عبادت؟" ممتاز نے شوخی سے پوچھا۔

موہنی چیخا "او شیمی! او شیمی، ہوائے ادھر آنا منع ہو رہا ہے"۔

شام کچھ دور جھاڑیوں پر سے جنگلی پھول چننے میں مصروف تھا۔ وہ رومال میں بہت سے پھول بھر کر لایا اور آتے ہی اس نے یہ پھول ممتاز اور پرویز کے سروں پر ڈال دیئے۔ موہنی جلدی سے ممتاز اور پرویز کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک پادری کی طرح شادی کا وظیفہ پڑھنے لگا کہ ممتاز نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور سب ہنسنے لگے۔

پٹیل کی گاگریں لئے مرہٹی لڑکیاں مندر کے قریب ایک خوشنما باؤلی پر آتی گئیں اور ان کی ساڑھیوں کے تیکھے رنگ کنارے مور کے چھپر نما فضا میں ناچنے لگے۔

زرد رنگ اڑ گیا تھا۔ شام جو ابھی ابھی اس قدر شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ اب گردن جھکائے کھڑا تھا۔

"مجھے بہت افسوس ہے، بہت افسوس ہے۔" موبی نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔ "میرا یہ منشا ہرگز ہرگز نہ تھا۔"

عذرا بہن نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "بیٹھو اب چائے پیئو، پھر ندی کے کنارے جا کر بیٹھیں گے۔ اور پرویز سے گانا سنیں گے۔"

چائے پیتے پیتے موبی نے وٹھل واڑی کی فضا کو اپنے احساسات میں رچنے اور جذب ہو جانے کے لئے اپنے تحت شعور کو ماضی کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اور جوں ہی اس کوشش کے زیر اثر اس کے پرانے محسوسات اور جذبات کا آہنی جال اس کے شعور، تحت شعور اور لاشعور سے الگ ہوتا گیا۔ اس کے جسم و جان میں وٹھل واڑی کا حسن سرایت کرتا گیا۔ یہ حسن زہر نہ تھا۔ یہ حسن شراب بھی نہ تھا۔ بلکہ ایک اعلیٰ اور رفیع مسرت بھری ہنسی کی طرح بے لوث، معصوم اور تقویت دینے والا جذبہ تھا.....

وہ آم کے پیڑ کے نیچے اپنے بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اور سنکیسر کے درختوں کی اس قطار کو دیکھنے لگا۔ جس کے شعلہ بداماں پھول ندی کے بہاؤ میں خوبصورت چراغوں کی طرح جگمگا رہے تھے، پانی کا مترنم بہاؤ اک سریلے گیت کی طرح ان حسین شمعوں کے گرد لرزتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اسے عذرا بہن کا وہ ناچ یاد آ رہا تھا جب وہ موی شمعوں کے ہالے میں رقص کرتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ مارونا کی مسکراہٹ..... اور کرسمس کی موی شمعیں.....

خدا جانے اسے کیوں ان ہندی عورتوں کے چہرے، مارونا کے سے معلوم ہوتے تھے۔ کیوں یہ زمین اس کی جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں یہ لوگ اسے

"فٹے مو" موبی نے ہنس کر اپنا ہات بلند کیا۔ "جانتے ہو شیمی میرا کرنل مجھ سے فٹے مو سن کر بے حد خوش ہوتا ہے، غالباً اسی وجہ سے اس نے مجھے جوجتسو گروپ کا افسر مقرر کیا ہے اور معلوم ہے تمہیں اس روز تمہارا کھیل دیکھ کر اس نے مجھ سے کہا تھا..... او بوائے..... او بوائے مجھے معلوم نہ تھا کہ ہندوستانی ڈرامے بھی اس بلند پایہ حقیقت نگاری کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب میں بھی ہندوستانی فلمیں دیکھا کروں گا۔ کل ہم اس جوش میں آکر شکنتلا دیکھنے چلے گئے..... خیر عذرا بہن تمہارا ناچ تمہارے ڈرامے کی جان تھا۔

شام نے موبی کو گھورا "اور ہمارا ذکر تک نہیں کرتے ہو بھوتنی کے میں اس ڈرامے کا ہیرو ڈیوسر تھا۔"

"فٹے مو" موبی نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔ شام اس کی طرف لپکا اور موبی ـــ بھاگا۔ شام اس کے پیچھے ایک سبز ٹیلے پر وہ دونوں خوب گتھم گتھا ہوئے، موبی نے جوجتسو سے وار کیا، پھر باکسنگ سے شام نے پہلوانی داؤ سے کام لیا اور چشم زدن میں موبی نیچے تھا اور شام اس کے اوپر پھر دونوں ہنس کر اور کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"سنو موبی" پرکاش سمجھانے لگا "یہ جوجتسو تمہارے کسی کام کی نہیں۔"

"پہلوانی سیکھ لیجئے۔" شام نے کہا "کرنل سے کہو کہ وہ اپنے سپاہیوں کو یہ سکھائے، مجھے ساتھ لے چلو..... ہندی پہلوانی کے مقابلے میں نہ باکسنگ چلتی ہے نہ جوجتسو۔"

"مگر تمہارے تنک کے تو کسی کام نہ آئی۔" پہلوان! موبی نے وار کیا اور اس نے دیکھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے دوسرے لمحے میں ہر ہندوستانی کا چہرہ

جوجتسو میں ریاضت، باکسنگ میں مقابلہ سیدھا اور صاف ہوتا ہے جوجتسو میں موقعہ شناسی اور عیاری سے کام لیا جاتا ہے۔" موبی نے اپنی انگلیوں پر گنتے ہوئے کہا۔

"یہ دونوں کھیل دو مختلف اقوام کی فطرت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

پرکاش نے کہا۔

پرویز نے اصرار کیا پھر بھی ان دونوں میں سے کس کو بہتر سمجھتے ہو؟"

عذرا بہن نے کہا "تم موبی سے پوچھ رہے ہو کہ وہ امریکہ اور جاپان میں کس کو پسند کرتا ہے۔"

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

حمید نے کہا جو جتسو میں سمجھتا ہوں سارا اڑنگے کا کھیل ہے اڑنگے پر لانے ہی کھلاڑی مخالف کو دے پٹختا ہے دراصل اس دنیا میں اڑنگا بڑی چیز ہے۔ شاید وہ کسی یونانی فلسفی کا قول ہے اگر اس کرۂ ارض کو کہیں پر ٹھیک طرح سے اڑنگے پر لایا جائے تو یہ زمین یوں چٹکیوں میں اپنے محور پر الٹی گھوم جائے۔"

پرکاش نے کہا جاپانی یہی کوشش کر رہے ہیں نا۔ لیکن نہیں جانتے کہ اڑنگے پر لانے کے لئے بھی کس قدر قوت درکار ہوتی ہے۔"

"موبی بولا۔ باکسنگ ہی سے آتی ہے۔" پھر گفتگو کا موضوع بدل کر کہنے لگا۔ "عذرا بہن اس روز واڈیا ہال میں آپ نے بنگال کے فاقہ مستوں کے لئے جو ڈرامہ کیا تھا وہ ہمیں بے حد پسند آیا۔"

تم کہاں بیٹھے تھے؟" ممتاز نے شکایت آمیز لہجے میں پوچھا۔

"چوتھی قطار میں میرا کرنل میرے ساتھ تھا۔"

"پھٹے منہ" شام چلایا۔

کے لمس کی طرح اپنے رخساروں پر محسوس کیا۔ اس نے دیکھا کہ رات یکایک زیادہ گہری ہو گئی ہے۔ تارے ایک دم جگمگا اٹھے ہیں۔ ہوا خوشبوؤں سے معمور ہو گئی ہے اور جنگ دور کسی گہری خندق میں جا چھپی ہے۔

موبی نے ایک تھکے ہوئے سکون طلب انداز میں اپنا بازو شام کے کندھے پر رکھ دیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ ایک بار پھر کہو شیمی تاکہ تمہارے ہونٹ تمہارے دلدار کے نام کو ایک بار پھر چوم سکیں..... او بوائے..... او بوائے.....!"

شام نے مسکرا کر موبی کا ہاتھ زور سے دبا دیا اور وہ دونوں سڑک پر چلنے لگے۔ دو رفیقوں کی طرح ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے تاروں کی دھندلی چھاؤں میں، دھندلکوں اور سیاہیوں کی شبنمی دنیا میں زیر آسمان دو آخری انسان!

دھتل واڑی میں جو پاک نگ ہوٹل تھی، اس میں حمید اور عذرا بہن نے موبی کو بھی مدعو کیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد موبی ان لوگوں سے ملا تھا اب اس کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا تھا۔ گردن اور چہرے پر خراشوں کے نشان تھے ــــ بلیاں پالتے رہے ہو گیا۔" حمید نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔"

موبی بے جھجک ہنسا، کہنے لگا۔" نیویارک میں ایک بلی ہے بس اسے پالنے کا ارادہ ہے، یہ جو جتسو کے نشان ہیں۔"

آج کل جو جتسو سیکھ رہے ہو۔" پرویز نے پوچھا۔

"نہیں سیکھ رہا ہوں، عرصہ ہوا میں نے اسے جاپان میں سیکھا تھا۔"

جو جتسو اور باکسنگ ان دونوں میں تم کس کو بہتر سمجھتے ہو؟" پرویز نے پوچھا"

باکسنگ میں مار کھانی پڑتی ہے جو جتسو میں چالاکی باکسنگ میں دیانت ہے۔

حیثیت مستحکم ہوگی لیکن اخلاقی اعتبار سے وہ بھی بے حد ناقص ہوگی۔ کیونکہ انسانی سماج ایک جسم ہے اگر اس کے کسی حصے پر زخم آجائے تو دماغ درد کرنے سے انکار نہیں کر سکتا شاید ابھی تم اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ہو۔ آٹھ دس جنگوں کے بعد سمجھو گے کہ امن اور جنگ کی طرح انسانی آزادی بھی ناقابل تقسیم ہے۔ وہ کل بنی نوع آدم کی میراث ہے۔ جب تک وہ سارے انسانوں میں مشترک نہیں ہوتی ہم تو غیر غلام رہیں گے ہاں لیکن تم بھی ہو گے۔ بیسویں سال اپنی نوجوان نسل کو موت کے گھاٹ اتارتے رہو گے۔ بیسویں سال اپنی نوجوان دلہنوں کو رانڈ اور اپنے بچوں کو یتیم کرتے رہو گے۔ تمہارے سیاست دان غالباً اسے دانشوری سے تعبیر کرتے ہوں گے میں تو اسے خودکشی کہوں گا۔"

"تم صحیح کہتے تھا موبی نے ہنس کر کہا" کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات مت کرو، وہ ہر پھر کر سیاست پہ آجائے گا۔"

شام کا لہجہ یکایک نرم پڑ گیا۔ اس نے شرمندہ سا ہو کر موبی سے کہا۔

"اچھا تو بتاؤ ۔۔۔ اور ۔۔۔ کیا باتیں کریں۔"

"فٹے منہ" موبی چلایا۔"

شام اور موبی ہنسنے لگے اور دقتی مغائرت دور ہو گئی۔

شام نے موبی کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اچھا ..... آؤ دوسرے دلدار کی باتیں کریں ..... پہلے میں اپنے محبوب کا سراپا بیان کرتا ہوں ..... پھر تمہیں موقع دونگا ..... سنو ..... اس کا نام ہے ۔ رمو ....."

شام کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں وہ اپنے محبوب کا نام بھی پوری طرح ادا نہ کر سکا وہ نام فضا میں شہد و شکر کی طرح گھل گیا۔ محبوب کا نام لیتے ہی اس کے لہجے میں ایسی ملاوٹ آگئی کہ موبی نے اس نام کو ایک مدھم میٹھے سانس

کہا گیا ہے کہ ہندوستانیوں سے تحفے تحائف نہ قبول کرو۔ اگر قبول کرو تو ایسے تحائف جو بہت ہی کم قیمت کے ہوں۔

"کیوں؟"

اس لئے کہ میں نے سنا ہے ہندوستانیوں کا دستور ہے کہ ایک حقیر سا تحفہ دیکر بہت بڑا انعام حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں۔

شام کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا یہ سچ ہے، اگر کاش یہ ہدایات آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو دی جاتیں، ہم تو اپنے تحفوں میں اپنے گھر بھی لٹا بیٹھے اس سے ہمیں جو فائدہ پہنچا وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان نے کبھی کسی کو نہیں لوٹا۔ وہ ہمیشہ خود لٹتا رہا ہے۔ تاریخ گواہ ہے ہندوستان میں ہمیشہ لوٹنے والے آتے رہے ہندوستانیوں نے کبھی باہر جا کر کسی ملک یا قوم کو نہیں لوٹا..... اور آج ہم پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے۔ اس تہذیب کے وارثوں کی طرف سے جنھوں نے ریڈ انڈین لوگوں سے ان کا سارا ملک ہتیا لیا تھا۔ خدا جانے اس وقت یہ ہدایت کیوں نہ دی گئیں۔

موبی نے غصیلا ہو کر کہا آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

"وہ سب کچھ جو تم غلام پورب کے لئے تجویز کرتے ہو آزادی، اور روٹی بلکہ ہمارے لئے صرف آزادی پھر روٹی ہم خود پیدا کر لیں گے۔"

موبی نے کہا آزادی دی نہیں جاتی حاصل کی جاتی ہے۔"

تو غلام پورب کو بھی کیوں نہ اس کی قسمت پر چھوڑ دو۔ اسے خود اپنے درد کا مداوا کرنے دو۔"

"یہ تمہارا اندرونی مسئلہ ہے ہم اس میں کیسے دخل دے سکتے ہیں۔"

"یہی سلوک پوربی قوموں کے ساتھ روا رکھو۔ جب تمہاری منطق

چند لاکھ روپے، یہ اناج کی چند بوریاں جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر پبلک کے ایما پر، یا حکومت کے نام پر بنگال میں صرف کی گئیں، بنگال کی بھوک کو مٹا دینے کے لئے کافی تھیں، یہ مدد تو آٹے میں نمک کے برابر تھی بنگال کو خود بنگال نے بچا لیا ہے۔ ورنہ آج تمہیں ایک بنگالی بھی زندہ نظر نہ آتا۔ قحط کی شدت کا وہ عالم تھا۔ آخر امداد کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ جو آدمی خود موت کے بھنور میں پھنسا ہو وہ دوسروں کی مدد کیا کرے گا۔ تمہارے گھروں میں خوشحالی ہے۔ فارغ البالی ہے۔ اجناس کی کثرت ہے تم لوگ ترس کھا کر اپنے ہمسایوں کی مدد کر سکتے ہو اُن کی مصیبت پر آنسو بہا سکتے ہو لیکن جس غریب کے پاس خود کھانے کو کچھ نہ ہو وہ اپنے ہمسائے کی کیسے مدد کریگا..... اور آنسو؟ اس منزل پر پہنچ کر آنسو بھی جواب دے جاتے ہیں آخر آنسو بھی تو روٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور جب روٹی ہی نہ ملے تو آدمی کیا دوسروں کی فاقہ مستی پر آنسو بہائے گا؟..... ہم ایک قوم نہ سہی بہت سی قومیں سہی..... لیکن یورپ میں بھی تو بہت سی قومیں ہیں۔ ہر قوم ان کی مدد کیلئے تیار ہے۔ ہمارے لئے کیوں نہیں۔ ہلقانی قومیں اور خصوصاً یونان کس منزل سے گذر رہا ہے وہاں اتحادیوں نے کس مشکل سے گندم کی بوریاں پہنچائی ہیں — اور یہاں مانگتے ہیں گندم کی بوریاں اور ملتی ہیں دھمکی کی بوتلیں"!

تو بی نے ہنس کر کہا "بس میں اپنے کانوں سے سن رہا ہوں"

"کیا مطلب؟"

"سب سن رہا ہوں، دماغ میں جگہ دے رہا ہوں۔ لیکن کچھ کہوں گا نہیں"۔ "کیوں؟"

"ہمیں ہدایات ہیں سب کچھ سن لو مگر منہ سے کچھ نہ بولو۔ خاص طور پر اس مسئلے پر — سنو مجھے ایک اور دلچسپ بات اس وقت یاد آئی۔ مجھ سے

ہے، تمہاری دلیل غلط ہے۔

میں جانتا ہوں یہ سپنے بہت بھیانک ہیں مجھے ان سے نفرت بھی ہے لیکن اس کا ثبوت کہ تم بھی سپنا نہیں دیکھ رہے ہو؟"

اس کی گواہی ہماری امریکی تاریخ ہے۔" موتی نے فخریہ لہجے" میں کہا انگریزوں کی جمہوریت پسندی ہے۔ روس کا اشتراکی نظام ہے چین کی کومن تانگ ہے۔ جسے سن یات سین ایسے آزادی پسند نے ترتیب دیا ہے ہمارا ضمیر بالکل صاف ہے۔

"اور ہندوستان" شام نے چڑ کر کہا غالباً تمہارا ضمیر بھی جنگی مصلحتوں کے پیش نظر لوہے اور کنکریٹ کا بنا ہوا ہے کہ اس پر کسی اخلاقی مہم کا اثر نہیں ہوتا۔"

موتی نے کہا میں اس ملک میں تمہارا مہمان ہوں تمہاری حکومت کا مہمان ہوں، مجھے اس ملک کے حالات کے بارے میں زیادہ آگاہی نہیں ہے۔ اور پھر میں یہاں کی پیچیدہ سیاست کی گتھیوں کو سلجھا بھی نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ جب میں پچھلے دنوں بنگال میں تھا اور ہزاروں آدمیوں کو بھوک سے مرتے دیکھ رہا تھا۔ تو بس یہی سوچ کر حیران ہوتا تھا۔ یہ کیسے لوگ ہیں اپنے سامنے اپنے بھائیوں کو اپنے عزیزوں کو مرتے دیکھتے ہیں۔ اور ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ ان کے لئے ان کے ہاتھ میں چاول کا ایک دانہ نہیں آنکھوں میں ایک آنسو نہیں، سچ کہتا ہوں میں نے ایسے پتھر دل لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ کیا یہ قومیت کا نقصان تو نہیں؟ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ شیخی! جیسے یہ ایک ملک نہیں کئی ملک ہیں۔ ایک قوم نہیں کئی قومیں ہیں ایک زبان نہیں کئی زبانیں ہیں ایک کلچر نہیں کئی کلچر ہیں ہر ایک دوسرے سے الگ ہے اور اپنی جگہ منفرد!

شام نے [illegible]

ساتھیوں کو مسیح پر ایمان لانے کی تلقین کر رہا تھا۔

"ہم گنہگار ہیں، ہم سب گنہگار ہیں"۔ "مسیح کے قدموں میں جھک جاؤ"۔

سننے والوں میں امریکن، کینیڈین، آسٹریلین اور انگریزی سپاہی تھے، جو چوراہے میں سے گزرتے گزرتے رک جاتے تھے، اور چند منٹ رک کر پھر چلے جاتے تھے، تین چار ہندوستانی بیرے بڑے غور سے اس لکچر کو سن رہے تھے اور پھر مدراسی زبان میں اس پر تنقید بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک گداگر ایک کوڑھی اور ایک خدمت گار جس کے پاس دو جگادری قسم کے کتے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے بڑے غور سے سن رہے تھے۔

"مسیح کے قدموں پر جھک جاؤ۔ ہم سب مسیح کے بھیڑیں ہیں"۔

بھیڑیں! بھیڑیئے؟ شام نے پوچھا۔

موتی نے کہا۔ غالباً تمہارا اشارہ جنگ کی طرف ہے" مجھے جنگ کی شقاوت سے انکار نہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ترقی کے آدرش کے لئے خون بہانا جائز ہے۔

"کس کا آدرش" شام نے پوچھا" کیا آدرش امیر کا ہوتا ہے ایک آدرش غریب کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش سفید آدمی کا ہوتا ہے ایک آدرش کالے آدمی کا ہوتا ہے۔ دونوں انسانی ترقی کے لئے سوچتے ہیں لیکن الگ الگ ان دونوں کے سینے جدا جدا ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جنگ نہیں۔ دو سینوں کی لڑائی ہے"۔

"تم سچ کہتے ہو، موتی نے جواب دیا لیکن یہ کالے اور گورے آدمیوں کے سینوں کی لڑائی نہیں ہم تو اس سینے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ جو فسطائیت کے اجارہ دار دیکھ رہے ہیں وہ سینا جو ٹوجو دیکھتا ہے جو ہٹلر دیکھتا ہے ایک کالا ہے۔ ایک گورا

موبی نے کہا۔ میں تو ان دوستوں کا شکر گذار ہوں جنہوں نے آج کے دن ....."
وہ چپ ہو گیا۔

جان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ پرویز صاحب آپ کیا تنخواہ لیتے ہیں؟" آٹھ سو روپے" پرویز نے کہا۔"

"بس" جان، پرویز کا جواب سن کر بہت حیران ہوا۔ ہمارے ہاں اتنی تنخواہ تو ایک کانکن لیتا ہے۔ آٹھ سو روپے؟"

حمید نے کہا۔" یہاں یہ تنخواہ بہت زیادہ ہے۔ ہندوستانیوں کی آمدنی فی کس چھ پیسے یومیہ ہے۔"

ہوں یہ بے حد غریب ملک ہے۔ مونٹریال کے ہوا باز جان نے لاپروائی سے کہا۔" موبی واپس کیمپ چلو گے؟"

ابھی نہیں! تم جاؤ، میں ذرا ٹھہر کر....."

"دونوں کینیڈین ہوا باز" گڈ نائٹ کہہ کر رخصت ہوئے اس کے بعد موبی بل ادا کرنے پر بڑی دیر تک مصر رہا۔ آخر جب شام نے اسے گالی دی۔ تب جا کر وہ چپ ہوا۔ بل ادا کر کے رستوران سے باہر نکلے تو پرویز، پرکاش حمید، عذرا، بہن اور ممتاز نے بھی رخصت چاہی۔

سولانگ

سولانگ

شام اور موبی اکیلے رہ گئے۔ وہ دونوں اب اس سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ جہاں انگریزی سینما گھروں کی عمارتیں تھیں، ہوا میں شراب تھی۔ کپڑوں میں عطر تھا۔ لبوں پر مغربی نغمے، نوشیرواں اینڈ سنز شراب فروش کی دوکان کے وسیع احاطے میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ اور ایک فوجی اپنے

ممتاز نے کہا "مجھے امریکی چاپ سوئی بہت پسند ہے"!
"شکریہ!" موتی نے خوش ہو کر کہا۔ "میں اسے اپنی کرسمس کا بہترین ٹوسٹ سمجھوں گا۔"
دو کیتلیڈین ہوا باز قریب سے گزرتے گزرتے رک گئے۔ موتی نے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور جھٹ اٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔
"یہ جان ہے، یہ ٹام ہے، یہ دونوں مونٹریال سے آئے ہیں۔" موتی نے اپنے ہندوستانی دوستوں سے ان کا تعارف کرایا۔ رسمی تعارف کے بعد وہ دونوں اسی میز پر بیٹھ گئے۔ "مگر ہم کچھ کھائیں گے نہیں۔" ٹام نے کہا "ہم ابھی ابھی"
پھر چند لمحے خاموشی رہی جیسی سازوں کا مدھم سریلا نغمہ ریکارڈ سے نکل رہا تھا۔
موتی نے کہا "..... جان ..... یہ کرسمس ..... وطن سے کتنی دور آیا ہے"۔ جان خاموش رہا۔
ٹام نے کہا "صنوبر پر برف دیکھنے کو جی چاہتا ہے ..... یہ باہر نظر دوڑاتا ہوں تو آسمان پر چمکیلے چمکیلے ستارے نظر آتے ہیں"
خان نے کہا "بیرا ایک گلاس پانی لاؤ"
موتی نے کہا "تمہارے چھوٹے چھوٹے بھائی بہن تمہارے ماں باپ کا دل بہلانے کو موجود ہوں گے۔ لیکن میری ماں کے پاس والد کے مر جانے کے بعد میرے سوا اور کون ہے؟ ..... شروع ہی سے جان ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب رہے ہیں کبھی کبھی ماں کی یاد تو مجھے بزدل بنا دیتی ہے"
ٹام نے کہا "اس وقت گھر میں موم بتیاں ہوں گی ..... کرسمس کا پیڑ! اور باہر گلی میں کارڈین کا نغمہ، ہائے بس ایک دفعہ تو اسے سننے کو جی چاہتا ہے

اور کو بھی دیکھنا چاہتی ہیں لیکن کس کو؟ - آج کرسمس ہے اور تمام تجارتی کے جھنڈے دیواروں پر اور آرپار بندھی ہوئی رسیوں کی طرح سجے ہوئے تھے، پرکاش کی نظر بار بار کسی اور جھنڈے کو بھی ڈھونڈ رہی ہیں لیکن کس کو..... وہ تصویر جو ابھی بنی نہ تھی وہ جھنڈا جو ابھی نا پید تھا..... پرکاش نے سوچا یہ..... اس کی دل کی اداسی کیوں بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ اسے ان بچارے شریف چینی دھوبیوں اور خوبصورت امریکی اور کینیڈین ہوا بازوں کے چہروں پر غرور اور تحکم کے آثار نظر آتے ہیں یا وہ چینی جو ہاتھ میں ایک پنسل اور کاغذ لئے آرڈر کے لئے..... مودب کھڑا تھا۔ پرکاش کو اس کے کھڑے ہونے کے انداز میں بھی ایک عجیب انداز تفاخر کی جھلک نظر آتی تھی، کیا یہ نظر کا دھوکا تھا یا اس کے ذہن کی ہمعیت۔

پرکاش بھی خاموش تھا۔ پوری مجلس پر خاموشی طاری تھی نہ جانے کیوں؟ موتی نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا مجھے اس رستوران کے تلے ہوئے پران بہت پسند ہیں۔ تمہیں پسند ہیں کیا؟

شام چونک پڑا "ہاں" اس نے آہستہ سے کہا اور ایک پران اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لیا۔ پھر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی لیکن ان کی میز کے علاوہ اور کسی میز پر ہندوستانی موجود نہ تھے، یہاں اپنے ہم وطن بہت کم ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر یکایک اسے خیال آیا۔ ہندوستانی یہاں کہاں؟ وہ تو بنگال میں اڑیسہ میں، آندھرا میں، مدراس میں، بہار میں بھوکا مر رہا ہے۔ جاہل! —— اس کا حلق رکنے لگا۔

پرکاش نے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا چینی چاپ سوئی میں وہ لطافت نہیں ہوتی ہے جو امریکی چاپ سوئی میں ہوتا ہے؟

حمید نے کہا "ہاں۔ اور غذائیت بھی کم ہوتی ہے۔"

پھٹے منہ"! شام کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پھٹے منہ" کیا۔

حمید نے کہا "یہ بھی ایک گالی ہے یہ سالا پنجابی بڑا ہے اور گالی کے سوا اور کچھ نہیں آتا اسے خوشی ٹیک، خوشی ٹیک۔

"ہاں یہ ٹھیک کہتا ہے یہ پوربیا!" شام نے موبی کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"مگر کہیں تو آج تمہیں کسی چینی رستوران میں لے جا کر کرسمس کا جشن منوا دیں جلدی بولو!"

"فٹے مو!" موبی نے اپنی ٹوپی ہوا میں اچھال کر کہا! "بس آج سے اپنے کرنل کو میں کہا کروں گا۔ او بوائے، او بوائے.....!!!

ننگ گنگ رستوران میں برقی قندیلوں کے فانوس کے نیچے کھانے کی میز تھی اور سامنے دیوار پر چیانگ کائی شیک، چرچل اور روزولٹ کی تصاویر تھیں۔ چیانگ کی آنکھیں اندھیگیں تھیں۔ لیکن چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ روزولٹ دولتی ملک کے حکمران کی طرح آسودہ اور مطمئن نظر آتا تھا۔ چرچل کے لب بھنچے ہوئے تھے اور اس نے سگار کو سختی سے دبا رکھا تھا۔ اس کے لبوں کی سختی اور اس کے آنکھوں کی ارادیت کہہ رہی تھی ہم مالک رہیں گے۔ پر کاش کو چرچل اور کلے نشو رحوم کے چہرے میں یکایک ایک طاقت سی نظر آنے لگی۔ خدوخال اور بناوٹ الگ ہونے کے باوجود ان دونوں چہروں کی روح ایک تھی۔ وہی مستقلانہ جذبہ وہی جیتے کا سا عزم اور کلے نشو کو بھی فرانسیسی "چیتا" ہی کہتے تھے۔..... پر کاش بار بار ان تصاویر کو دیکھ کر رک جاتا تھا۔ یکایک اسے احساس کہ اس کی آنکھیں دیوار پر کسی

ہندوستانی تصویر نہیں دیکھی۔ دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تو چلو۔"

تانگہ گوا آئی تو اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ سینما پہنچے تو ٹکٹ لے کر اندر بیٹھے تو مونگ پھلی، تلے ہوئے آلو، دال، چیوڑا اور کباب کھانے لگے۔ کباب کھا چکے تو پان آ گئے، موبی ہر بار اپنی جیب سے پیسے نکالتا، لیکن وہ لوگ اسے ٹال دیتے گھبراؤ نہیں ہم جانتے ہیں کہ امریکی سپاہی امیر ہوتے ہیں ہم بھی کسی روز تمہاری کھال اتار لیں گے مگر آج نہیں۔ آج تو کرسمس ہے۔"

تصویریں دیکھی گئیں۔ سب نے موبی سے پوچھا۔ موبی نے مروت میں تعریف کر دی اچھی تھی مگر گانے بہت زیادہ تھے۔ غالباً میوزیکل ہوگی؟"

اس نے پوچھا۔

یہاں ہر پکچر میوزیکل ہوتی ہے۔ مسٹر! شام گرجا سمجھے۔ مسٹر موبی؟

اس نے سگریٹ کا کش تو زور سے کھینچتے ہوئے موبی کو گھورا۔

مسٹر کیوں نہیں؟ مسٹر کیوں؟ موبی نے پوچھا۔"

"بس میں تو اسے اسی طرح کہتا ہوں جس سے مجھے محبت ہو جاتی ہے سمجھے بھوتنی کے۔"

بھوتنی کے ..... کیا مطلب؟" موبی نے حیرت سے پوچھا۔"

"مطلب وطلب ہم نہیں جانتے، بس یہ نیاز کی باتیں ہیں، سمجھے موبی وہ بی چوچی موچی" شام نے موبی کے سنہری بالوں کو سہلا دیا۔

موبی نے خوش ہو کر کہا۔" اچھا اب تمہیں شام کے بجائے شیمی کہا کروں گا۔"

"شیم شیم! حمید نے کہا۔

اپنے اسٹوڈیو کی حفاظت کے لئے ایک افغانی کو کیوں مقرر کر رکھا ہے؟"

پرویز نے کہا۔ "ہماری قوم کا دستور یہی ہے ہم اپنے ملک کی حفاظت کے لیے انگریزوں کو رکھتے ہیں اور اپنے اسٹوڈیو کے لئے افغانیوں کو۔"

"تو کیا تم اپنے اسٹوڈیو کی خود حفاظت نہیں کر سکتے؟"

پرویز نے تلخی سے کہا۔ "اگر ایسا کر سکتے تو تمہیں سمندر پار سے یہاں آنے کی دعوت دیتے۔"

موبی نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ میں امریکی سپاہی ہوں میرا نام موبی ہے ..... میں تمہارا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پرویز نے فخر کرتے ہوئے کہا مزاج کیسا ہے۔ میرا نام پرویز ہے اسٹوڈیو! مگر آج تعطیل ہے۔ اسٹوڈیو کے مالک یہاں نہیں ہیں اور پھر آج تو رسمس ہے، تم اسٹوڈیو کیوں دیکھنا چاہتے ہو، آج تو کسی ناچ گھر میں کسی نازک کمر یا!"

موبی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "مجھے ناچ پسند نہیں۔"

پرویز نے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا پھر کہنے لگا۔ آؤ تمہیں اپنے دوستوں سے ملا دوں۔

برآمدے میں بہت سے لوگ بید کی کرسیوں پر بیٹھے برج کھیل رہے تھے۔ پرویز نے تعارف کرایا۔ یہ ممتاز ہیں۔ یہ خدیجہ بہن، یہ حمیدہ، یہ کاشف، یہ شام ہم لوگ اس وقت اسٹوڈیو کی فارگو کے انتظار میں بیٹھے ہیں، تصویر دیکھنے جا رہے ہیں۔" کون سی تصویر؟"

کوئی سی بھی ..... ہندوستانی تصویر دیکھیں گے تم بھی چلو گے ضرور؟"

موبی تذبذب کے بعد بولا۔ "ہاں ..... میں نے آج تک کوئی بھی

چوکیدار کا چہرہ اس وقت ایک قندھاری انار کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا بلند آواز میں بولا۔ "صاحب اندر آتا ہے ام بولتا ہے تمہارا کاغذ کدھر ائے۔ صاحب کے پاس کاغذ نہیں اے، تو ام کیسے جانے دیگا"

موہنی نے پرویز سے کہا۔ "یہ چوکیدار بڑا بد تمیز ہے"

پرویز نے کہا۔ "آزاد ملک کا رہنے والا ہے نا! ابھی غلامی نہیں سیکھی"

پرویز نے پٹھان کو اجازت نامہ لکھ کر دیا اور موہنی کو اندر آنے کو کہا۔ پٹھان پرچہ لے کر بڑبڑایا۔ او خوام قندھاری پٹھان ہے۔ ام کسی سے نہیں ڈرتا اے ام کابل سے آیا ہے اے، خوام اپنے ملک میں صاحب لوگ کی ریل گاڑی کو بھی گھسنے نہیں دیتا اے۔ او خو ریل گاڑی آئے گا تو صاحب لوگ بھی آئیگا۔ او خو تم ہندوستانی بڑا بیوقوف ہے"

کیا کہہ رہا ہے یہ خبیث؟ موہنی نے پوچھا۔

پرویز نے بتایا تو وہ ہنسنے لگا۔ اچھا ہوا میں نے اپنا ہاتھ روک لیا ورنہ میں اسے ایک چانٹا تو ضرور لگا دیتا۔ کو مجھ سے کہا گیا ہے کہ کبھی کسی صورت میں ..... کسی ہندوستانی کو چانٹا نہ مارا جائے"

پرویز نے کہا۔ "ہاں اچھا ہوا۔ کیونکہ وہ ہندوستانی نہیں افغانی ہے۔ افغان! موہنی نے معصومیت سے پوچھا۔ "دونوں میں کیا فرق ہے؟

پرویز نے کہا۔ "وہ ہندوستانی ہوتا تو چانٹا کھانے کے بعد دن بھر تمہاری جوتیاں سیدھی کرتا اور شام کو تمہیں سلام کر کے بخشش کا طالب ہوتا۔ مگر یہ چوکیدار تو افغانی ہے اور ایک افغانی اور ہندوستانی میں یہی فرق ہے کہ افغان کے پاس چھری ہوتی ہے اور ہندوستانی کے پاس سلام"

موہنی مسکرایا۔ "میں تم سے سیاست پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ بتاؤ تم نے

کہ یہ لوگ بڑے بددیانت اور محسن کش ہوتے ہیں۔ قطعی ناقابل اعتبار اور ..... غریب کس قدر ہیں۔ بھئی! یقینی ہمارے ہاں کی بیبیاں یہاں کی عورتوں سے زیادہ فربہ دکھائی دیتی ہیں۔ .. اور کچھ بھی ہو انسانی مساوات کا فلسفہ درست سہی لیکن اس کالے رنگ نے احساس نعرت کو زندہ کر دینے کی قوت ضرور موجود ہے۔ پھر یکایک موبی کو کیمو کا خط یاد آیا۔ موبی اور کیمو دونوں مل کر ایک ایسا شیشہ بنانے کی سعی کر رہے تھے کہ جسے پردہ جنگیٹر پر چڑھا دینے سے سیاہ اور سفید فلمی تصویریں خود بخود قدرتی رنگوں میں جلوہ گر نظر آئیں گی۔ کیمو کا یہودی ذہن دماغ اس مشکل کو حل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اب وہ موبی کے ذریعہ سے اس ایجاد کو پیٹنٹ کرا رہا تھا۔ کیمو نے لکھا تھا کہ موبی ہندوستانی اسٹوڈیو اور سینما گھروں کے مالکان سے بھی اس ایجاد کی کمپنی کے بارے میں بات چیت کرے کیا ہرج ہے؟ اگر موبی ہندوستانی بھنگی، باورچی، بیرے، بساطی سے بات چیت کر سکتا تھا تو ان ہندوستانیوں سے کیوں نہیں، جو تصویریں بناتے تھے، وہ تیزی سے سائیکل گھما کر اسٹوڈیو کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ پر اسے رکنا پڑا۔ کیونکہ پٹھان چوکیدار راہ روکے کھڑا تھا۔ چوکیدار نے اسے اسٹوڈیو کا اجازت نامہ دکھائے بغیر اندر جانے سے روک دیا۔ موبی کے پاس اجازت نامہ کہاں سے آیا۔ لیکن ہندوستانی چوکیدار کی یہ ہمت؟ اس نے سائیکل بڑھا کر مجھے جانے دو میں اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لہجے میں تحکم تھا۔ تفخر اور غرور لیکن چوکیدار پھر بھی مرعوب نہ ہوا اور بات بڑھ گئی۔ راہ گیر اکٹھے ہو گئے۔ پیرویز نے جب دیکھا امریکی فوجی کو لوگوں میں گھرے دیکھا۔ وہ اس وقت پورچ میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ تو وہاں سے آہستہ آہستہ اسٹوڈیو کے دروازے پر گیا کہ دیکھے کیا تماشا ہے؟ "کیا بات ہے لالہ؟" اس نے چوکیدار سے پوچھا۔

اور اکیلے گھومنے سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ چھاؤنی کے کاروباری افراد بھی اُسے پسند نہ آتے تھے۔ اور سینما میں بالعموم ہالی وڈ کی وہی تصویریں دکھائی جاتی جس میں عریانیت کی نمائش زیادہ ہوتی۔ کیا سینما کے مہتمم فوجیوں کو اس قدر بد ذوق سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کو ایسی باتوں کے علاوہ اور کسی چیز کی طلب نہیں، یہ سوچ کر اُسے اکثر اس قدر غصہ آتا تھا کہ وہ معقول کسی سینما گھر کے قریب نہ پھٹکتا..... یہ بات نہ تھی کہ اُسے سینما سے نفرت تھی لیکن وہ تو ہالی وڈ کی ان تصویروں کو دیکھنا چاہتا تھا جو سماجی نکتہ کی حامل ہوتیں۔ لیکن ایسی تصویریں یہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔

اسی لئے تو وہ اکثر سائیکل لئے سڑکوں پر اکیلا چکر کاٹتا نظر آتا...

اسٹوڈیو کے سامنے سے وہ کئی بار گزر چکا تھا۔ لیکن اسٹوڈیو کے اندر جانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اُس نے اس خواہش کو ہر بار اپنے دل میں دبا دیا تھا۔ پھر بھی یہ خواہش بار بار ابھر آتی تھی، خیر جتنی گہری ہو خواہش اسی قدر بے چین ہوتی.....

نہ جانے گور میں مُردوں کا کیا حال ہوتا ہوگا..... ہاں کرسمس کے دن تو خود موتی کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔ اس قدر پریشان آوارہ کھویا کھویا محسوس کر رہا تھا کہ دوبارہ وہ اسٹوڈیو کے سامنے سے گزرا اور ایک نگاہ ڈال کر گزر گیا تیسری بار جب وہ گھوم پھر کر لوٹا تو اس نے سوچا کیا ہرج ہے۔ ہندوستانی ایک ناقابل اعتبار مخلوق سہی، جاہل غلام، کالے نکمے احساس کمتری کے شکار سہی۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ فلمیں بناتے ہیں۔ یہ فلمیں تکنیک کے اعتبار سے ناقص ہوں گی لیکن جہاں تک فلمی صنعت اور فلموں کی تعداد کا تعلق ہے اس وقت ہالی وڈ کے بعد ہندوستانی فلمی صنعت کا نام آتا ہے..... آخر ایسا کیوں ہے..... پھر اس نے سوچا نہیں ان لوگوں سے ملنا ٹھیک نہیں اس نے سُن رکھا تھا

کرشن چندر

موبی

موبی ادھی ادکار رہنے والا تھا۔ اور فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے تیویارک میں وکالت کرتا تھا۔ موبی کے بال گھنے اور گہرے سنہری تھے اور یہی سونا اس کے رخساروں پر تھا۔ ایسا سونا جو ماہ ستمبر میں سیب کی جلد پر رخشاں نظر آتا ہے۔ موبی کا قد چھ فٹ سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اس کا قہقہہ بے جھجک اور بچپن کی طرح معصوم تھا۔ نتھنوں کے درمیان ناک کی کرنی پر ایک چھوٹا سا تل تھا۔ اس چھوٹے سے سیاہ نقطے نے موبی کے چہرے کو شباب کی تمام سرخیوں کے باوجود بھولا اور معصوم سا بنا دیا تھا۔ اور وہ اس بچے کی طرح دکھائی دیتا، جس نے اپنی ناک کو قلم کی نوک سے میلا کر لیا ہو اسی لئے تو پرویز اسے "غلیظ" موبی کہا کرتا تھا۔ اس پر موبی اور پرویز میں اچھی خاصی چخ رہتی جو اکثر یقاتہ ہاتھا پائی تک بڑھ جاتی.....!

پرویز اور شام کی ملاقات موبی سے اس کے اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ موبی آسام اور بنگال سے لوٹ کر یہاں چند ماہ کے لئے آیا تھا شروع ڈسمبر کے دنوں میں وہ اکثر چھاؤنی کی سڑکوں پر اکیلا گھومتا ہوا نظر آتا۔ لیکن اب اسے چھاؤنی کی سڑکوں پر سیکل کی سواری کرنے سیٹی بجاتے

کثرت سے لکھے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں، دُنیا کی اور کئی زبانوں میں ان کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ خاص کر روس میں آپ کو اور آپ کی تخلیقات کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا ہے۔ دو مرتبہ روس جا چکے ہیں اور چین، انگلستان اور دیگر ممالک کی سیاست بھی کی ہے، ۱۹۶۶ء میں ہند روس، دوستی اور عالمی امن کی کوشش کے صلے میں آپ کو آٹھ ہزار روپوں کا نہرو ایوارڈ ملا، ادھر ماسکو یونیورسٹی کی اردو ہندی لکچرار نے آپ کی افسانہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھا اور ادھر ڈاکٹر محمد حسن نے آپ کی شخصیت اور فن پر تحقیق لکھی اور الہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۶۲ء میں پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

"موبی" کرشن چندر کا ایک معیاری افسانہ ہے

کرشن چندر

شہرۂ آفاق افسانہ نگار کرشن چندر ۱۹۱۴ء میں وزیر آباد پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں لاہور کے ایک کالج سے انگریزی میں ایم اے کیا۔ اور اس کے تین سال بعد ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ چند دن انگریزی اور اردو رسالوں کی ادارت کرتے رہے۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ اور لاہور، دہلی اور لکھنؤ کی نشر گاہوں میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے دو ایک سال کام کیا۔ اس کے بعد فلمی صنعت سے متعلق ہو گئے اور بمبئی میں فلموں کے لئے کہانیاں اور مکالمے لکھنے لگے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے اردو ناولوں اور داستانوں کے مطالعے کا بڑا شوق رہا۔ پھر خود بھی افسانے لکھنے لگے۔ آپ کی بہن سرلا دیوی اور دونوں بھائی مہندر ناتھ اور اوپندر ناتھ مشہور افسانہ نگار ہیں۔

کرشن چندر اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اور دنیا کے عظیم افسانہ نگاروں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کے لحاظ سے ترقی پسند ادیب ہیں۔ اپنے جادو نگار قلم سے زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں بڑی بے نظیر فن کاری اور حساسی سے بناتے ہیں اور حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ معیاری افسانے اور ناول

آج تک اسے کبھی ناکامی نہ ہوئی تھی۔ اس لئے وہ اس قسم کی خبر پاتے ہی....
اضطراری طور پر گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کھڑا منتر پڑھتا رہا
ایک بار منتر ختم ہو جاتے پر وہ کیلاش کو جڑی سونگھا دیتا تھا۔ ادھر کہار
لوگ کیلاش کے سر پر پانی انڈیلتے چلے جاتے تھے۔ دو بجتے بجتے کیلاش
نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔

بھگت نے پوچھا، بابو یہاں کسی کو پہچانتے ہو۔

کیلاش نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا۔ ہاں صاحب سب کو
پہچانتا ہوں، وہ پاپا ہیں یہ ماما ہیں وہ مرنالنی ہیں۔

مسز چڈھا بھگت کے پیروں پر گر پڑیں۔ ڈاکٹر چڈھا دوڑ کر
کیلاش کے گلے سے لپیٹ گئے۔ چاروں طرف سے احباب نے مبارک باد
دینا شروع کیا۔ بھیتر باہر ہلچل مچ گئی۔ کمرہ میں دوستوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ
تل رکھنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ ہر شخص بھگت کے درشنوں کا مشتاق تھا۔
ڈاکٹر صاحب نے بیگ کرا اپنا سیف کھولا اور گنیوں سے بھری ہوئی، ایک تھیلی
نکال لائے۔ وہ اسے بھگت کے پیروں پر رکھ دینا چاہتے تھے۔ مگر جب وہ
تھیلی لے کر کمرہ میں پہنچے تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف بھگت کی
تلاش ہونے لگی۔ کہاں گئے۔ کہاں گئے، ابھی تو یہیں کھڑے تھے۔ بھیتر باہر
سب جگہ چھان ڈالی گئی۔ مگر بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

مسز چڈھا نے کہا کوئی دیوتا تھا۔

احباب نے کہا ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

پھر جشن شروع ہوا۔ نغمہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اور باجے
بجنے لگے۔

سمجھا کوئی مریض آیا ہوگا۔ کسی اور وقت انہوں نے اس آدمی کو دتکار دیا ہوتا رات کے وقت وہ کسی مریض کو نہ دیکھتے تھے۔ مگر آج وہ فوراً گھر میں سے نکل آئے اور وقت آمیز انداز سے بولے، کیا ہے بھئی، آج تو ہمارے اوپر ایسی مصیبت آپڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا۔ پھر کبھی آنا۔

بھگت نے کہا سب حال سن چکا ہوں۔ بابو صاحب۔ اسی لئے تو آیا ہوں۔ جرا میں بھی دیکھ لوں۔ چھوٹے بھیا کہاں ہیں۔ بھگوان بڑا کارساج ہے۔ کون جانے اب بھی اسے دیا آجائے۔

ڈاکٹر چڈھا نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ اچھی بات ہے چلو دیکھ لو تین چار گھنٹے ہو گئے ہیں۔ ہم تو نراس ہو گئے۔

بھگت نے اندر جا کر ایک منٹ تک لاش کو دیکھا۔ تب مسکرا کر بولا ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ بابو جی واہ، نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بابو جی اٹھ بیٹھیں گے۔ جرا کہاروں سے کہئے پانی تو بھریں۔

بوڑھے کا لہجہ اتنا یقین انگیز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کچھ امید پیدا ہو گئی۔ بولے۔ بوڑھے بابا بس یہی سمجھ لیجئے کہ ہم سب عمر بھر آپ کے غلام..... رہیں گے۔ اس لڑکے پر ہم اتنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔

مسٹر چڈھا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ دادا جی ہماری جنم بھر کی کمائی ہے، بس اور کیا کہوں۔

بوڑھے بھگت کے پاس ایک ایسی جڑی تھی کہ سانپ کیا ہی زہریلا ہو اس کا زہر زائل ہو جاتا تھا۔ اس جڑی کے ساتھ ہی وہ ایک منتر بھی پڑھتا تھا۔ اس منتر میں کچھ ایسی تاثیر بھی کہ پہلے ہی دم میں مارگزیدہ کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ بھگت کو اپنے زود زہر کی طاقت پر پورا اعتماد تھا۔

میں وہاں سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں، ذرا دیکھوں گا لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا، کس طرح سر پیٹتے ہیں۔ کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ ذرا دیکھوں گا۔ بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں۔ یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو دیوان ہوتے ہیں۔ من میں سمجھ کر رہ جاتے ہیں۔

اس طرح نفس کو دھوکا دیتا ہوا، شیطان کو بہکاتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا کہ دو آدمی راستہ سے گزرے، دونوں میں ڈاکٹر چڈھا ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک نے کہا چڈھا بابو کا گھر اُجڑ گیا۔ دوسرا بولا۔ کل بھی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا بھگت کی چال اور بھی تیز ہو گئی۔ ضعف کے مارے قدم نہ اٹھتے تھے۔ مگر ہمت ہوا سے باتیں کر رہی ہے۔ سر کا حصہ اتنا آگے بڑھا جاتا گویا اب منہ کے بل گر پڑیگا۔ اس طرح کوئی بیس منٹ چلا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں روشن تھیں مگر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نالہ، وشیون کی صدائیں بھی نہ سنائی دیتی تھیں۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں دیر تو نہیں ہو گئی۔ وہ دوڑنے لگا۔ اپنی عمر میں وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا گویا اس کے پیچھے موت دوڑی آ رہی ہے۔

(۴)

کیلاش بیجان پڑا ہوا تھا جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت باقی نہ تھی، مگر کوئی بلند آواز سے نہ روتا تھا۔ گریۂ خاموش ڈوبنے والی امید کی آخری شعاع۔

یکایک بھگت نے برآمدہ میں پہنچ کر پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے

چھو لیا ہے۔ چاہے مر بھی گیا ہو، تم چلے جاؤ۔ تو سائت بچ جائے سُنا دس ہجار تک دینے کو تیار ہیں۔ نہ دس ہجار دیں گے، دس سو تو دینگے۔ (ہزار) میں تو نہ جاؤں گا۔ چاہے وہ دس لاکھ بھی دیں، مجھے دس ہجار لے کر کرنا ہی کیا ہے۔ کل کو مر جاؤں گا تو کوں بھوگے گا۔ میں تو اُن کے دروازے پر ہوتا تب بھی نہ جاتا۔ ایسے بیدردوں کی سجا یہی ہے۔

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے آگے پیر بڑھائے۔ جیسے کسی مخمور آدمی کا اپنے فعلوں پر قابو نہیں ہوتا۔ وہ کہتا کچھ ہے، زبان سے نکلتا کچھ ہے وہ اپنی دانست میں پاؤں سنبھال کر رکھتا ہے۔ پر وہ لغزش کرتے ہیں وہی حالت بھگت کی تھی۔ نفس انتقام پر تلا ہوا تھا، پر عمل پر اس کا قابو نہیں تھا۔ جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی وہ ارادہ کرنے پر بھی تلوار نہیں چلا سکتا، اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔

دو میل کا راستہ تھا۔ بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا چلا جاتا تھا۔ ادراک ثانی اولیٰ پر حاوی تھا۔ اولیٰ روکتا تھا، ثانی ٹھیلتا تھا۔ آدھا راستہ طے ہو جانے پر یکایک بھگت رُک گیا۔ نفس نے قوت عمل پر فتح پائی۔ ارے! میں اتنی دور چلا آیا۔ اس جاڑے پالے میں مجھے مرنے کی ضرورت کیا تھی۔ آرام سے پڑا کیوں نہ رہا۔ نہ نیند آتی دو چار بھجن ہی گاتا ناحق اتنی دور دوڑا۔ چڈھا کا لڑکا رہے یا جائے۔ میری بلا سے مجھے کیا کرنا ہے۔ دنیا میں ہزاروں جیتے ہیں، ہزاروں مرتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے مطلب، جس نے میرے ساتھ ذرا بھی سلوک نہیں کیا۔ اس کے ساتھ میں کیوں سلوک کروں۔

مگر نفس کی یہ فتح عارضی تھی۔ وہ ادراک ثانی جو اُسے اتنی دور لایا تھا ایک دوسری ہی صورت میں نمودار ہوا جو نفس سے بہت مشابہ تھا

نیند کاہے کو آئیگی۔ من تو چڈھا بابو کے گھر پہ لگا ہوا ہے۔
چڈھا بابو نے میرے ساتھ ایسی کونسی نیکی کر دی ہے جو وہاں جاؤں، وہ آکر پیروں پڑیں تب بھی نہ جاؤں۔
مانو چاہے نہ مانو، پر تم اٹھے اسی ارادے سے تھے۔
نہیں ری ایسا پاگل نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے بوئے۔ اس کے لئے، پھول بوتا پھروں۔
بڑھیا پھر سو گئی، بھگت نے کواڑ لگا دیئے اور پھر آکر بیٹھا، مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پاکر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا۔ غصہ سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت سے روک رہا تھا پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا جا رہا تھا جو اس وقت مر رہا تھا۔ اور جس کے لئے ایک ایک لمحہ کی دیر بازیافت کے امکان کو اور دور ٹال رہی تھی۔
اس نے پھر کواڑ کھولے، اتنے آہستہ سے کہ بڑھیا کو خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل آیا۔ اسی وقت محلہ کا چوکیدار گشت لگا رہا تھا۔ بولا کیسے اٹھے بھگت آج تو بڑی سردی ہے۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟
بھگت نے کہا۔ نہیں جی جاؤں گا کہاں، دیکھتا تھا کہ ابھی کتنی رات ہے۔ بھلا گجے بجے ہوں گے۔
ایک بجا ہوگا۔ اور کیا، ابھی تھانے سے آرہا تھا۔ تو چڈھا کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی تھی۔ اس کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہوگا۔ کالے نے

کسی کی اس نے کبھی پرواہ نہ کی۔ وہ تو راہ گھر سے نکل پڑتا تھا، بے نت بے غرض، معاوضہ کا خیال کبھی۔ دل میں آیا ہی نہیں، نہ کبھی کسی نے کچھ دیا ہی۔ یہ معاوضہ کا کام ہی نہ تھا۔ جان کا کیا معاوضہ یہ ایک کار ثواب تھا۔ اسے جو دیا آتی تھی اس کا لازمی استعمال سینکڑوں مایوسوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کر دی تھی۔ پر آج وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ اپنے کانوں سے یہ خبر سن کر اطمینان سے سونے کی کوشش کر رہا ہے۔

بڑھیا نے کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔ "تماکو کے ڈھائی پیسے ہو گئے۔ آج دیتی ہی نہ تھی۔

بھگت نے کپی بجھائی اور کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ کر سوچتا رہا۔ بعد ازاں لیٹ گیا۔ یہ خبر اس کے جگر پر بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ جیسے سارے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں، یا پیروں میں کیچڑ لگا ہوا ہے، جیسے کوئی اس کے دل کے اندر بیٹھا ہوا اسے گھر سے نکلنے کے لئے تحریک کر رہا ہے۔ بڑھیا ذرا دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے بولتے بولتے سو جاتے ہیں اور چوہے کا ریگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بھگت کو جب اطمینان ہو گیا کہ بڑھیا سو گئی ہے تو وہ اٹھا، اور اپنی لکڑی ٹٹول کر اٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا چونک پڑی، بولی۔ کہاں جاتے ہو؟

کہیں نہیں دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔

ابھی بہت رات ہے سو جاؤ۔

نیند نہیں آتی۔

ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہوگا لالہ کو، ساری صاحبی بھول جائے گی۔ ہمارا کیا بگڑا۔ کچھ لڑکے کے مرجانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ تمہارا تو راج سونا ہو جائے گا۔ اسی لڑکے کے واسطے سب کا گلا دبا دبا کر دھن جوڑا تھا نہ، اب کیا کروگے؟

منگلی چلا گیا۔ بھگت نے چلم اٹھائی، اور پڑوس کے حلوائی کی بھٹی سے آگ رکھ لایا۔ پھر کواڑ بند کرکے اطمینان سے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا۔ اتنی رات گئے جاڑے پالے میں بھیجنے آیا تھا۔ موئے کو شرم نہ آئی۔

بوڑھا۔ رات نہیں دوپہر بھی ہوتی تو میں نہیں جاتا۔ اس کی سواری دروازے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا ہوں، پتا کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس نرموہی نے ایک نظر بھی تو نہیں دیکھا کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہ بچے گا۔؟ خوب جانتا تھا۔ وہ بھگوان نہیں تھا کہ اس کے ایک نظر دیکھ لینے سے امرت برس جاتا نہیں۔ کھالی من کی دوڑ تھی۔ جرا تسکین ہو جاتی۔ بس اسی لئے اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی دن پھر جاؤں گا۔ اور کہوں گا۔ کیوں صاحب! کہئے کیا رنگ ہے؟ دنیا مجھے برا کہے گی۔ کہے، کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہی ہیں۔ بڑوں میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ وہ دیوتا ہوتے ہیں.....!

اسّی سال کی عمر میں بھگت کے لئے پہلا موقعہ تھا کہ ایسے سانحے کی خبر سن کر بھی وہ گھر سے باہر نہ نکلا، ماگھ پوس کی اندھیری رات میں، جیٹھ، بیساکھ کی دھوپ اور لو، ساون بھادوں کے موسلا دھار مینہ

بھگت نے چونک کر سر اُٹھایا۔ چڑھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڑھا بابو ہیں نہ جو بنگلے میں رہتے ہیں۔ پورب طرف؟

منگلی نے کہا۔ ہاں ہاں وہی نامی آدمی ہیں، چاروں اور ہلا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو کہاں؟ آدمی بن جاؤ گے۔!

بوڑھے نے بیرحمانہ انداز سے سر ہلا کر کہا، میں نہیں جاتا۔ میری بلا جائے۔ وہی چڑھا ہیں (دھوپ) جانتا ہوں، آدمی نہیں (کپائی، رضائی) ہے۔ آج آٹھ سال ہوئے (رقوبہ) .....!

بوڑھیا نے تصحیح کی، نواں لگا ہے۔

بوڑھیا۔ ہاں نواں سال ہے، میں پتا کو لے کر دکھانے گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ پیروں پر گر پڑا کہ ایک (بخر) دیکھ لیجئے۔ مگر اس نے بات تک نہ سُنی، بھگوان بیٹھے سُن رہے تھے (نظر) اب معلوم ہوگا کہ بیٹے کا (گم) کیسا ہوتا ہے۔ کئی لڑکے ہیں؟ (گم)

منگلی۔ نہیں جی۔ یہی تو ایک لڑکا ہے۔ سُنا ہے سب لوگوں نے جواب دیدیا ہے۔ گنگو گوالا۔ مدد بہنا، مہتہ سب ہار کر چلے آئے۔

بوڑھا۔ بھگوان بڑا کارساز ہے۔ ارے تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر پڑا۔ اس کے پیروں پر پگڑی اتار کر رکھ دی۔ مگر اسے (جرا) دیا نہ آئی۔ میں تو اس کے (دروازے) پر ہوتا تب بھی بات نہ پوچھتا (دروازے) ایسے لوگوں (دوار) کو یہی سجا ہے۔

منگلی تو نہ (سنا) جاؤ گے؟ ہم نے تو سُنا تھا تم سے کہہ دیا۔

بوڑھا۔ بہت اچھا کیا۔ سُن کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ تم جاؤ۔ آج چین کی نیند سوؤں گا۔ (بڑھیا سے) جرا تمباکو لے، لے

(۳)

ایک چھوٹے سے کچے مکان میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ انگیٹھی میں آگ نہ تھی، صرف من کو بہلانے کا ایک سامان تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی پوال اور دو تار تار کمل خوش آیند نیند کے ضامن نہ ہو سکتے تھے۔ انگیٹھی میں کم سے کم گرم راکھ تو تھی۔ دونوں خاموش تھے۔ دونوں صبر کے پتلے اور صبر بھی کیسا! بے مزہ، ان کی زبان پر نہ زمانہ کا شکوہ تھا نہ مرنے والوں کا ذکر غم! ان کا سارا وقت مصاف حیات میں صرف ہوتا تھا موت دروازہ پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔ باتوں کی کہاں فرصت، فرداہی نہ ہو تو غم کس کا۔

بڑھیا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا۔ کل کے لئے سن تو ہے ہی نہیں کیا ہوگا...؟

جاکر بھگڑو ساہ سے اُدھار لاؤں گا۔

اس کے پہلے کے پیسے تو ابھی دیئے ہی نہیں، اُدھار نہ دے گا۔

نہ دیگا نہ سہی، گھاس تو کہیں گئی ہے، دوپہر تک کیا دو آنہ کی بھی نہ چھیل سکونگا۔ اور کیا کرنا ہے۔

اتنے میں ایک آدمی نے دروازہ پر آواز دی، بھگت کیا سو گئے کیا؟ ذرا کواڑ کھولو، میں ہوں منگلی۔

بھگت نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ منگلی نے کوٹھری میں آکر کہا۔ کچھ سنا چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا ہے

سانپ نہ پالو۔ جان کا خطرہ ہے۔ مگر میری کون سنتا تھا۔ بلایئے کسی جھاڑنے والے کو بلایئے۔ میرا سب کچھ لے لے۔ میں اپنی ساری جائیداد اس کے پیروں پر رکھ دوں گا۔ لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا۔ مگر میرا کیلاش میرا لخت جگر اٹھ بیٹھے، ایشور کے لئے بلایئے۔ مجھ پر رحم کیجئے۔

بنگلہ سے کچھ دور پر کچھ گوالے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سانپ کا منتر جانتا تھا۔ اس نے آکر کئی بار منتر پڑھا کئی بار کیلاش کے کان میں چلایا پھر پیچ سوں گھڑے پانی اس پر ڈلوائے، پر بازیافت کی کوئی علامت نہ دیکھ کر مایوس چلا گیا۔ ایک دو منتر والے اور بھی آئے۔ ان سبھوں نے بھی منتر پڑھے دوائیں پلائیں، سونگھائیں، نہلایا۔ شور مچایا، مگر کوئی نتیجہ نہ دیکھ کر رخصت ہو گئے۔ بوڑھے نے آکر کیلاش کی صورت دیکھتے ہی کہا اب میں کیا منتر پڑھوں سرکار جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔

ظالم! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو چکا۔ جو کچھ ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا۔ مرنالنی کو آغوش محبت میں بٹھانا کہاں نصیب ہوا۔ زندگی کے وہ سنہرے خواب جن سے زندگی نوبہار ہو جاتی تھی۔ کیا پریشان نہیں ہو گئے۔ تمناؤں زرنگار جھیلوں میں لطف سیر اٹھاتے ہوئے کیا ان کا بجرا غرقاب نہیں ہو گیا۔ جو ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ البتہ ہو گیا۔

وہی نورانی سبزہ زار تھا۔ وہی سنہری چاندنی ایک نغمۂ خاموش کی طرح منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی مجمع احباب تھا۔ وہی تفریح کے سامان تھے۔ مگر اب ان پر تالے ماتم کر رہے تھے۔ اور شبنم آنسو بہاتی تھی بارات وہی تھی، پر دلہا رخصت ہو گیا تھا۔

اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی، کیلاش کیسی طبیعت ہے؟ کیلاش نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ پھر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

مسز چڈھا نے بگڑ کر شوہر سے کہا۔ کھڑے منہ کیا تاک رہے ہو۔ کوئی چیز دیتے کیوں نہیں۔؟

مرنالنی نے کہا ماں دیکھئے، ان کا چہرہ کیسا ہوا جاتا ہے۔

چڈھا نے بچھتا کر کہا۔ کیا بتلاؤں، میں اس کی باتوں میں آ گیا ابتو نشتر سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

یہ کہتے ہوئے انہیں کچھ خیال آ گیا۔ پھر دوڑے ہوئے مطب میں گئے اور کوئی مرکب بنا کر لائے، بڑی مشکل سے کیلاش کا منہ کھولا گیا۔ وہ دوا ڈالی گئی۔ مگر زہر اتنا قاتل تھا کہ دوبارہ لہر نہ آئی۔ دوائی کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گذرا تھا کہ کیلاش کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ چہرہ سفید ہو گیا۔ نبض کا کہیں پتہ نہیں، موت کی ساری علامتیں نمودار ہو گئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ مرنالنی ایک طرف سر پیٹنے لگی، ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی اور ڈاکٹر چڈھا تو ایسے بدحواس ہو گئے کہ اگر دوستوں نے شور مچا لیا ہوتا تو شاید اپنے گلے پہ نشتر چلا لیتے۔

ایک صاحب بولے کوئی منتر جھارنے والا مل جائے تو ممکن ہے اب بھی جان بچ جائے۔

دوسرے صاحب نے فرمایا، ارے صاحب قبر سے نکلی ہوئی لاشیں زندہ ہو گئی ہیں۔ ایسے ایسے باکمال پڑے ہوئے ہیں۔

چڈھا نے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔ میری عقل پہ پتھر پڑ گیا تھا کہ اس کی باتوں میں آ گیا۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ بار بار سمجھاتا رہا کہ بیٹا

زمین پر رکھنا چاہا۔ مگر وہ کالا گیہوں غضب ناک ہو رہا تھا۔ گردن نرم ہوتے ہی اُس نے کیلاش کی انگلی میں زور سے کاٹا۔ اور وہاں سے بھاگا انگلی سے ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا۔ کیلاش نے فوراً زور سے انگلی دبائی اور اپنے کمرہ کی طرف دوڑا۔ اس کی میز کی دراز میں ایک جڑی رکھی ہوئی تھی جس کے استعمال سے قاتل زہر بھی رد ہو جاتا ہے۔ دوستوں میں ہلچل پڑ گئی۔ ڈاکٹر صاحب بدحواس ہو کر دوڑے، وہ جڑی بوٹی کے قائل نہ تھے۔ انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے، پر کیلاش کو جڑی پر کامل اعتقاد تھا۔ فوراً جڑی پیسی گئی اور انگلی پر اس کا لیپ کیا گیا۔ کیلاش تو مطمئن ہو کر باقی سانپوں کو ڈربے میں بند کرنے لگا۔ مگر ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب پریشان تھے۔ مرنالنی پیالو چھوڑ کر دوڑی آئی تھی وہ بار بار ڈاکٹر صاحب سے کہتی آپ نشتر لگا دیجئے مگر ڈاکٹر صاحب تذبذب کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مشکل سے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کیلاش کو سر میں چکر محسوس ہوا، اور دیکھتے دیکھتے اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑنے لگا۔ مگر ابھی تک وہ ضبط کئے کھڑا تھا اور سب سے کہتا تھا آپ لوگ اندیشہ نہ کریں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب گو خاموش کھڑے تھے۔ پر کیلاش کے چہرے کا اڑتا ہوا رنگ دیکھ کر ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا وہ جلدی سے مطب میں آ گئے اور کئی چیزیں ایک گلاس میں ملا کر لائے۔ کیلاش نے ایک بے غرضانہ انداز سے گلاس لے لیا اور منہ میں لگانا ہی چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا، گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا، وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ میز کا پنکھا لگا دیا گیا۔ اور تیز ہوا چلنے لگی۔ مرنالنی نے دوڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔

اس پر ایک دوسرے مہربان بولے، مجھے یقین تو نہیں آتا۔ مگر چونکہ تم کہتے ہو اس لئے مان لیتا ہوں۔

کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔ نہیں صاحب آپ کے آنکھوں سے دیکھ لیجئے۔ تب مانئے، دانت توڑ کر قبضہ میں کیا تو مجھ میں اور مداری میں فرق ہی کیا رہا۔ سانپ بڑا سمجھ دار ہوتا ہے، اگر اُسے یقین ہو جائے کہ اس آدمی سے مجھے کوئی گزند نہ پہنچے گا تو وہ اُسے ہرگز نہ کاٹے گا۔ دانت اس کا آلہ مدافعت ہے۔

مرنالنی نے دیکھا کیلاش پر اس وقت جنون سوار ہے تو اُس نے یہ تماشا ختم کرنے کو کہا اور بولی، اب یہاں سے چلو دیکھو باہر گانا شروع ہو گیا۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی، یہ کہہ کر اس نے کیلاش کا کندھا پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا۔ اور کمرہ سے چلی گئی۔ کہ کیلاش معترضوں کو خاموش کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اُس نے سانپ کی گردن پکڑ کر اتنے زور سے دبائی کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جسم کی ساری رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اب تک اُس کے ہاتھوں اس قسم کا بیرحمانہ برتاؤ نہ دیکھا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اُسے شاید خیال ہوا کہ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی محافظت کے لئے آمادہ ہو گیا۔ کیلاش نے اس کی گردن دبا کر اس کا منہ کھول دیا۔ اور اس کے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ جن صاحبوں کو شبہ ہو آ کر دیکھ لیں، آیا یقین؟ یا اب بھی شک ہے؟

دوستو نے قریب آ کر اس کے دانت دیکھے اور کیلاش کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ عینی شہادت کے سامنے شبہ کی گنجائش کہاں؟ اُن کا اطمینان کر کے کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کر دی، اور اُسے

اس پہ دوستوں نے قہقہہ لگایا، ایک صاحب بولے، دیکھنا تو آپ سب چاہیں، لیکن کوئی دکھائے بھی۔"

کیلاش کو مرنالنی کے لہجے سے معلوم ہوا کہ اس وقت اس کا انکار ناگوار گزرا۔ جونہی دعوت ختم ہوئی اور گانا شروع ہوا۔ اس نے مرنالنی اور چند احباب کو سانپوں کے ڈربے کے سامنے لیجا کر مہور بجانا شروع کیا۔ پھر ہر ایک خانے کو کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ کیا کمال تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیڑے اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں، کسی کے ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ کسی کو گردن میں ڈال لیا، کسی کو ماتھے کے گرد لپیٹ لیا۔ مرنالنی بار بار منع کرتی تھی۔ انہیں گردن میں نہ ڈالو۔ دور ہی سے دکھا دو۔ بس ذرا نچا دو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھ کر اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ افسوس کر رہی تھی کہ میں نے ناحق انہیں چھیڑا۔ مگر کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ معشوقہ کے روبرو اپنے کمال کے اظہار کا ایسا موقعہ پا کر کون چوکتا ہے؟

ایک صاحب بولے دانت تو توڑ ہی ڈالے ہوں گے۔

کیلاش نے ہنس کر کہا۔ جی نہیں بندہ نواز، دانت توڑنا مداریوں کا کام ہے، کسی کے دانت نہیں توڑے گئے۔ کہئے تو دکھا دوں۔

یہ کہہ کے اس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ میرے پاس اس سے بڑا اور زہریلا دوسرا جانور نہیں ہے۔ اگر کسی کو کاٹ لے تو آناً فاناً آدمی مر جائے۔ اس کا کوئی علاج نہیں، دکھا دوں اس کے دانت؟

" مرنالنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا، نہیں، نہیں کیلاش۔ ایشور کے لئے اسے چھوڑ دو۔ تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔"

کیلاش نے ٹالتے ہوئے کہا، اس وقت معاف کرو، مرنالنی کل دکھاؤں گا۔"

مرنالنی نے ایک انداز سے ماتھا سکوڑ کر کہا، جی نہیں، تمہیں دکھانا پڑے گا میں نہیں ماننے کی۔ تم یوں ہی روز کل کل کرتے رہتے ہو۔

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے اور ایک دوسرے پر فدا۔ کیلاش کو سانپوں کو نچانے اور کھلانے کا شوق تھا طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے۔ ان کی عادات و خواص کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ سانپوں پر تھوڑے دن ہوئے انہوں نے یونیورسٹی کلب میں ایک نہایت دلچسپ تقریر کی تھی۔ اور سانپوں کو نچا کر دکھایا تھا ایک بوڑھے سپیرے سے اس نے یہ فن سیکھا تھا۔ سانپوں کی کشتی ہی جڑی بوٹیاں اس نے جمع کر رکھی تھیں۔ مرنالنی کا اصرار بے موقع تھا۔ سانپوں کے کمرے میں بہت ہجوم ہو جائیگا۔ اس لئے وہ ٹال رہا تھا، اور شاید مرنالنی مان بھی جاتی، مگر دوستوں کو چین کہاں؟ ایک صاحب بولے دکھا کیوں نہیں دیتے۔ بھئی ایک ذرا سی بات کے لئے اتنا ٹال مٹول کر رہے ہو۔ مرنالنی ہرگز نہ مانتی، دیکھو یہ حضرت کیسے نہیں دکھاتے۔ دوسرے صاحب بولے مس مرنالنی اس قدر سیدھی اور بھولی ہیں۔ جبھی آپ اتنا مزاج کرتے ہیں۔ دوسری ہوئی اسی بات پر بگڑ کھڑی ہوتی۔ تیسرے صاحب نے فرمایا "اجی بولنا چھوڑ دیتی، صورت نہ دیکھتی، اس پر آپ کو دعویٰ ہے کہ مس مرنالنی کے لئے جان حاضر ہے۔

مرنالنی نے ان شہدوں کی طرف تمسخر کی نگاہوں سے دیکھکر کہا "آپ لوگ میری وکالت نہ کریں، میں اس وقت نہیں دیکھنا چاہتی۔ چلو چھٹی ہوئی۔

بڑھتی گئی اور صحت تو ان کی بمثال تھی۔ یہ اُن کی پابندی اوقات کا نتیجہ تھا کہ پچاس سال کے سن میں بھی ان کی چستی و جفاکشی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی۔ اکثر لوگ صحت کے قواعد کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب صحت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چڈھا علاج اور انسداد کے راز کو خوب سمجھتے تھے۔ ورنہ ڈاکٹر ہی کیوں ہوتے۔ تعیّن اولاد بھی انہیں قواعد میں تھا۔ اُن کے صرف دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ تیسری اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ شریمتی چڈھا کی صحت میں بھی کسی قسم کا ضعف نہ تھا۔ دونوں بچے صحت اور زندہ دلی کے پتلے تھے۔ لڑکی کی تو شادی ہو چکی تھی۔ لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ سبزۂ آغاز نوجوان تھا۔ مردانہ حسن کا اعجاز، ذہانت کا پتلا تحریر و تقریر میں یونیورسٹی کا مایۂ ناز۔ چہرہ سے نور برستا تھا۔ ہر ایک دائرہ کا مرکز نگاہ خوش گلو، خلیق، منکسر المزاج آج اس کی بیسویں سالگرہ تھی۔

رات کا وقت تھا ہری ہری گھاس پہ کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤساء اور حکام ایک طرف، کالج کے طلبہ دوسری طرف بیٹھے ہوئے دعوت کھا رہے تھے، بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قایم بنا ہوا تھا۔ تفریح کے سامان بھی جمع تھے۔ ایک چھوٹے سے فارس کھیلنے کی تیاری کی گئی تھی۔ فارس خود نوجوان چڈھا کی تصنیف تھی۔ وہی خاص ایکٹر بھی تھا۔ وہ اس وقت ایک ریشمی کرتہ پہنے، تنگے پاؤں دوستوں کی خاطر و مدارات میں مصروف تھا۔ کوئی پکارتا چڈھا ذرا ادھر آنا، کوئی ادھر پکارتا چڈھا کیا ادھر ہی رہو گے؟۔

یکایک ایک حسینہ نے آکر کہا، کیوں کیلاش تمہارے سانپ کہاں ہیں؟ وہ مجھے بھی تو دکھا دو ۔ !

ڈاکٹر نے کلائی پر نظر ڈالی، چھ بجنے میں صرف ۱۰ منٹ باقی تھے۔ گولف اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے،۔

کل سویرے آؤ ہم کھیلنے جاتا ہے۔

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور رو کر بولا۔ ہجور ایک نگاہ دیکھ لیں، لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا۔ سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے ہجور، ہم دونوں آدمی رو رو کے مر جائیں گے۔

ڈاکٹر نے چلمن اٹھائی اور موٹر کی طرف چلے۔ بوڑھا پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔ سرکار بڑا دھرم ہوگا۔ ہجور دیا کیجئے۔ مگر ڈاکٹر صاحب مطلق مخاطب نہ ہوئے۔ موٹر پر بیٹھ کر بولے کہہ دیا کل سویرے آؤ۔

موٹر چلی گئی۔ بوڑھا کئی منٹ تک سکتہ کے عالم میں کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں۔ شاید اسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ پھر اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ یہ غریب چاروں طرف سے مایوس ہو کر چڈھا کے پاس آیا تھا۔ ان کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہاں سے جواب پا کر پھر وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس نہ گیا۔ قسمت ٹھونک لی۔

اسی رات کو اس کا سات سال کا ہنستا کھیلتا بچہ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بوڑھے ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ زندگی کا یہی ایک سہارا تھا۔ اسی بچے کا منہ دیکھ کر دونوں جیتے تھے۔ اب دنیا ان کے لئے تاریک ہو گئی۔

(۲)

کئی سال گذر گئے، ڈاکٹر چڈھا کا اثر دولت اور شہرت ماہ نو کی طرح

پریم چند

منتر

(۱)

شام کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جا رہے تھے، موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے... دروازے پر آکر اندر جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر اُسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی چلائے نہ دوڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا: "کون ہے کیا چاہتا ہے؟" بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا، "حجور بڑا غریب آدمی ہوں۔ میرا لڑکا کئی دن سے.....!

ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ کل سویرے آؤ۔ سویرے ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔ بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا اور بولا۔ دہائی ہے سرکار کی ہجور لڑکا مر جائے گا۔ چار دن سے آنکھیں.....

پریم چند

دھن پت رائے اصل نام تھا، پریم چند کے قلمی نام سے لکھتے تھے۔ بنارس کے پاس ایک گاؤں میں ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی خانگی تعلیم پائی اور بنارس کے کالیجیٹ سکول سے انٹرنس پاس کیا، چند سال صیغۂ تعلیمات میں ملازم رہے۔ بعد کو تحریک آزادی کے سلسلے میں ملازمت ترک کر دی۔ عمر بھر ادبی کام میں مشغول رہے اور ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

پریم چند نے اردو میں بیسیوں مختصر افسانے، متعدد ناول اور کچھ ڈرامے لکھے ہیں، پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، زادِ راہ، واردات، وغیرہ مختصر افسانوں کے مقبول عام مجموعے ہیں۔ اور چوگان ہستی، میدان عمل، گوشۂ عافیت، بازار حسن اور گئودان وغیرہ مشہور و معروف ناول مختصر افسانہ نگاری میں پریم چند نے اپنے جوہر دکھلائے ہیں، "سادہ" آسان اور عام فہم زبان میں لکھتے ہیں۔ طرز بیان بھی سادہ رواں اور زور دار ہوتا ہے۔ آپ کے افسانے عام دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان میں غریب کسانوں، مزدوروں اور دیہاتیوں کے اعلیٰ کردار پر روشنی ڈالتے ہیں اور ان کی زندگی کی مصیبتوں کا دردناک بیان بڑے موثر انداز میں کرتے ہیں۔ ان میں جذبۂ قومیت اور حب وطن کا رنگ جھلکتا ہے۔

"منتر" میں پریم چند نے ایک مغرب زدہ ڈاکٹر اور ایک غریب دیہاتی کے کردار کا مقابلہ اور موازنہ بڑی حسن و خوبی سے بیان کیا ہے۔

کو رکھا جائے گا۔ جو فرقہ وارانہ خیالات کا پرچار کر کے
عوام کو آپس میں لڑاتے ہیں۔ تو خواتین و حضرات۔ یہ
ہے۔ وہ بلند آدرش جس کی تکمیل کے لئے اس پاگل خانے
کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ آخر میں آپ کی اجازت سے یہ
تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ وحشت صاحب کو اس
پاگل خانے میں ایک کوٹھڑی ضرور عطا کی جائے۔ تاکہ
وہ مجھ ایسے شریف حضرات کو آئندہ دق نہ کر سکیں۔"

پروفیسر دانش کے آخری فقرے پر وحشت بہت سیخ پا
ہوا لیکن اس اثنا میں پروفیسر صاحب پلیٹ فارم سے اتر کر سیکل
پر سوار ہو چکے تھے۔ اس سے پیشتر کہ وحشت صاحب ان سے اپنے
الفاظ واپس لینے کو کہتا وہ نرغنہ سے دہلی جانے والی سڑک پر
سائیکل چلاتے ہوئے گنگنا رہے تھے ؎

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اہل جنوں کی

N.B.A.N.M.'s High School (Main) LIBRARY

ACC. No.....
CLASS No.....
Date.....

اس سرعت سے بڑھ رہی ہے کہ ہم سب پریشان ہیں کہ انہیں کہاں رکھا جائے گا۔ زمانہ ماضی میں صرف عشاق کو پاگل تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن عصر حاضر میں ہر شخص پاگل ہے۔ معاف کیجئے بہت سے اشخاص پاگل ہیں۔ زمانہ سلف کے دیوانے بے ضرر انسان ہوا کرتے تھے۔ ان کے مشاغل محدود تھے۔ یعنی بیٹھے بیٹھے اگر ان کے دل میں درد اٹھتا تھا تو زیادہ سے زیادہ اپنا گریبان پھاڑ ڈالتے تھے یا سنگ آستان سے اپنا سر پھوڑ لیتے تھے۔ لیکن زمانہ حال کے دیوانے سخت خطرناک واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ بکار خویش ضرورت سے زیادہ ہوشیار ہیں۔ ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ عوام میں نفرت اور حقارت کے بیج بو کر اپنی دیوانگی چمکائی جائے۔ ہمیں ان لوگوں پر کڑی نگرانی رکھنی ہوگی۔ میرے خیال میں آپ کو اس پاگل خانے میں تین وارڈ بنانے ہوں گے۔ پہلے وارڈ میں ان تمام سر پھرے لیڈروں کو رکھا جائے گا۔ جن کی دانست میں ملک کو کسی ریفارم کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک آزاد ملک میں عوام کو بھوکوں مرنے اور ننگے پھرنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ دوسرے وارڈ میں وہ نااہل پنڈت اور مولوی رکھے جائیں گے۔ جن کے نزدیک مذہب ہر وقت خطرے میں ہے۔ اس ضمن میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کو تادم زیست پاگل خانے سے باہر آنے کی اجازت نہ دی جائے۔ نیز پاگل خانے کے ضوابط کے مطابق انہیں نہایت خطرناک جنونی تصور کیا جائے۔ تیسرے وارڈ میں ان نیم خواندہ ایڈیٹروں

خواتین و حضرات! میرے بارے میں کہا گیا ہے کہ میری ذات تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے مجھے کالج کی چار دیواری کے باہر کوئی نہیں جانتا۔ اور بعض اشخاص مثلاً سینیٹ جماعتوں کے طلبہ تو مجھے کالج کی چار دیواری میں بھی نہیں پہچانتے۔ میرا شمار علماء میں نہیں ہوتا۔ کیونکہ میں اس حد تک جاہل نہیں ہوں جس حد تک ہمارے بیشتر علماء واقع ہوئے ہیں۔ میں ایک نہایت گمنام آدمی ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ اگر میرا چہرہ قدرے اور بدصورت اور جسم کافی منحنی ہوتا تو میں وزیر یا کم از کم سفیر ہوتا لیکن افسوس خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔ میں ایک کالج میں پچاس روپے ماہوار مشاہرے پر مدرس ہوں اور طلبہ کی اغلاط سے پرکاپیوں کو دیکھ دیکھ کر عاجز آ گیا ہوں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے آج سے قبل کسی عمارت کا سنگ بنیاد نہیں رکھا۔ میں عمارتوں کے سنگ بنیاد کو ایک نہایت مذموم بدعت سمجھتا ہوں۔ میری دانست میں یہ کام معماروں اور انجینئروں کا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک پروفیسر سے جسے اتنا بھی معلوم نہیں کہ ریت اور سمنٹ میں کیا فرق ہے۔ اس قسم کی درخواست کرنا بیہودگی کی انتہا ہے ـــــ میرا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ گزشتہ زمانے میں کسی خوبصورت عمارت کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا۔ آپ ہی بتائیے لال قلعہ یا قطب مینار کا سنگ بنیاد کس نے رکھا تھا؟ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔ اب ذرا پاگل خانے کی طرف آیئے۔ جس کا سنگ بنیاد میں نے ابھی ابھی رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں غیر سرکاری پاگل خانوں کی تعمیر ایک نہایت مبارک فال ہے، بدقسمتی سے ہمارے ملک میں پاگلوں کی تعداد

پاگل خانے کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا۔ اکٹھے ہو رہے تھے۔ حسب وعدہ پروفیسر دانش اپنی ٹوٹی پھوٹی سیکل پر سوار ہو کر شام کے چھ بجے تشریف لائے۔ وحشت نے قصبہ کے معززین کے معیت میں آپ کا استقبال کیا۔ انہیں گڑ کی چائے پلائی پھولوں کے ہار پہنائے اور خواتین و حضرات سے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

"پروفیسر دانش کی ذات تعارف کی محتاج نہیں آپ کا شمار ملک کے ان علماء میں ہوتا ہے جن پر ہم سب کو ناز ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے پاگل خانے کا سنگ بنیاد رکھنا قبول کیا۔ میں نہایت ادب سے ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس مبارک رسم کو اپنے مبارک ہاتھوں سے ادا فرمائیں۔"

پروفیسر دانش نے جلدی جلدی پتھر کے چبوترے پر سمنٹ لگائی اور مزدوروں کو جو لمبے لمبے رسوں سے ایک بہت بڑے پتھر کو تھامے کھڑے تھے اشارہ کیا کہ سنگ بنیاد کو نیچے آنے دیں۔ حاضرین تالیاں پیٹیں اور پروفیسر صاحب گھبراہٹ کے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگے۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ سنگ بنیاد مطلوبہ جگہ پر رکھا جا چکا ہے تو انہوں نے دو ایک بار کھانسنے کے بعد حاضرین سے خطاب کیا۔

"خواتین و حضرات! میں آپ کا شکریہ ادا نہیں کروں گا۔ کیونکہ اگر میں ایسا کروں تو اس کا مطلب ہو گا کہ مجھے واقعی آپ کے قصبے میں آ کر خوشی ہوئی حالانکہ یہاں تک پہنچنے میں جتنی کوفت مجھے اٹھانی پڑی اس کا اندازہ کچھ میں ہی کر سکتا ہوں۔ اوّل تو آپ لوگوں نے اپنا قصبہ دہلی سے اتنے فاصلے پر بنایا ہے کہ سائیکل چلاتے چلاتے میری پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ دوسرے جو سڑک آپ کے قصبے کو دہلی سے ملاتی ہے اتنی گرد آلود ہے کہ میری شیروانی کا ستیاناس ہو گیا۔"

سنگِ بنیاد رکھ سکیں۔"

"تو پھر کسی وزیر یا گورنر سے التماس کیجئے۔"

"وزراء اور گورنر حضرات کو پارٹیوں سے فرصت ہی کب ملتی ہے کہ وہ کسی اور کام کی طرف متوجہ ہو سکیں۔"

"کچھ بھی ہو میں اس کام کے لئے ہرگز تیار نہیں۔"

"ضد نہ کیجئے۔ پروفیسر صاحب قوم کو آپ سے بہت توقعات ہیں۔"

"قوم کا نام سن کر پروفیسر صاحب بھنّا اٹھے اور انہوں نے تیخ کر کہا۔ قوم جہنم میں جائے۔ قوم نے میرے لئے کیا کیا ہے کہ میں اس کی پروا کروں، جب ملک غلام تھا تو میں پچاس روپے ماہوار پاتا تھا۔ اب جب ہم آزاد ہیں میں اسی تنخواہ پر پڑھا رہا ہوں۔ مجھے قوم سے کوئی ہمدردی نہیں، کیونکہ قوم کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔"

"مجھے یہ سب معلوم ہے اس کے باوجود میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ سنگِ بنیاد رکھنے کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں۔"

"میں نہیں ہوں۔"

"آپ ہیں۔"

"میں ہرگز نہیں ہوں۔"

"آپ بالکل ہیں۔"

یہ بحث دیر تک جاری رہی اور جب بحث بحث پروفیسر دانش کا سانس اکھڑنے لگا تو انہوں نے اور چارہ کار نہ دیکھتے ہوئے تسلیم کر لیا کہ وہ اس کام کے لئے موزوں ترین آدمی ہیں۔"

اتوار کے دن نرغنہ جیسے دور افتادہ قصبے میں خوب چہل پہل تھی۔ لوگ جوق در جوق "مجنوں پارک" میں کہ جہاں ملک کے پہلے غیر سرکاری

معاملے میں غلطی نہیں کی ہے۔"

"میں آپ کی خدمت میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ سے التماس ..... قطع کلام معاف" پروفیسر دانش نے بات کاٹتے ہوئے کہا اگر آپ اس لئے تشریف لائے ہیں کہ میں آپ کے کسی عزیز کے جس نے یونیورسٹی کا امتحان دیا ہے۔ نمبر بڑھا دوں تو میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھ سے یہ اُمید ہرگز نہ رکھیے گا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی پروفیسر صاحب قبلہ، میں اس غرض سے ہے حاضر نہیں ہوا۔"

تو پھر! پروفیسر دانش نے دانت پیستے ہوئے کہا۔" تو پھر آپ...."

نووارد نے معاملہ بگڑتے ہوئے دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔" میں آپ سے التجا کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ اس تلوار کو" نرغنہ" تشریف لائیں۔ اور اپنے دست مبارک سے ایک غیر سرکاری پاگل خانے کا سنگ بنیاد رکھیں۔"

پاگل خانے کا سنگ بنیاد! لاحول ولا" پروفیسر نے کرسی اُچھل کر کہا حضرت آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے، جو ایسی نامعقول درخواست میرے پاس لے کر آئے ہیں۔ اس مطلب کے لئے تو آپ کو کسی قومی رہنما کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میں پاگل.....

گستاخی معاف وحشت نے سنجیدگی سے کہا میں متعدد رہنماؤں سے درخواست کر چکا ہوں لیکن بدقسمتی سے وہ اتنے مصروف ہیں کہ انہیں ایک لمحے کی فرصت نہیں۔ ایک صاحب اس ہفتے سات مقبروں کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں دوسرے پانچ یتیم خانوں کی رسم افتتاح فرما رہے ہیں۔ اور تیسرے رعشہ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اور اُن کے ہاتھوں میں سکت نہیں کہ کسی عمارت کا

دانت پیسنا پروفیسر دانش کا محبوب شغل تھا۔ انہیں جب کوئی کام نہ ہوتا تو وہ دانت پیسنا شروع کر دیتے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ ایک نہایت ذلیل قماش کا آدمی اندر داخل ہوا پہلے تو پروفیسر صاحب نے سمجھا کہ پیشہ ور گاہک ہے۔ لیکن جب وہ جھک کر کورنش بجا لایا تو انہیں اپنی رائے ترمیم کرنی پڑی۔

آداب عرض پروفیسر دانش نے مصنوعی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ تشریف رکھئے۔

پروفیسر صاحب کے کتب خانے میں ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کے علاوہ جس پر وہ خود تشریف فرما تھے۔ دوسری کوئی چیز نہ تھی۔ اس لئے نو وارد تشریف رکھنے سے معذور رہا۔ یہ دیکھ کر پروفیسر صاحب نے اپنے چہرے پر ایک اور مصنوعی مسکراہٹ کے آثار پیدا کرتے ہوئے کہا۔

تشریف رکھنا بھی ایک تکلف ہے کیوں نہ آپ کھڑے کھڑے مجھ سے گفتگو کریں۔ کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"

میں بہت دور سے آپ سے شرف نیاز حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا ہوں"

"شکریہ! بہت بہت شکریہ! آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ نرغنہ، نرغنہ،

نرغنہ عجیب نام ہے" میرا مطلب ہے۔ میں نے آج تک ایسا بیہودہ نام نہیں سنا"

"میرا نام وحشت ہے"

"ایک نہ شد دو شد یقیناً آپ کے والدین نے نام انتخاب کرنے کے

پروفیسر کنھیا لال کپور

پروفیسر دانش

پروفیسر دانش اپنے کتب خانے میں جو بیک وقت ان کا کتب خانہ اور دیوان خانہ تھا۔ دیوان غالب پر لکھی ہوئی ایک شرح کا مطالعہ کر رہے تھے شارح نے ایک نہیں متعدد اشعار کا مطلب اس انداز میں بیان کیا تھا کہ پروفیسر دانش کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ معاً ان کی نظر اس شعر پر پڑی۔

ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شارح نے اس کی توضیح حسب ذیل الفاظ میں کی تھی۔

ہمیں ان شارحین سے عقل و دانش کی توقع ہے جو یہ بھی نہیں جانتے کہ عقل و دانش کس بلا کا نام ہے۔

اس شعر میں مرزا غالب نے ان شارحین پر چوٹ کی ہے جنھوں نے خاکسار سے پہلے دیوان غالب پر شرحیں لکھیں۔

شعر کی یہ تفسیر پڑھ کر دانش بھونچکا رہ گئے۔ اپنی گنجی چاند پر وہ ایک بار ہاتھ پھیرا۔ لاحول پڑھا اور کتاب بند کرتے دانت پیسنے لگے۔

کنہیّا لال کپور

اردو کے مشہور طنز نگار کنہیا لال کپور انگریزی کے پروفیسر ہیں، پنجاب کے متوطن ہیں، ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۴ء میں ایم اے کیا اور لاہور ہی کے ایک کالج میں انگریزی کے پروفیسر ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان آ گئے۔ اور یہاں بھی پروفیسری کا سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر کپور ایک کامیاب پروفیسر ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک باکمال طنز نگار بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کی گفتگو میں بھی طنز و ظرافت کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ اور نوک و نشتر وغیرہ آپ کے طنزیہ مضامین کے مجموعے ہیں جو قبول عام کا خلعت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کے طنزیات میں شوخی اور ظرافت بھری ہوئی ہے۔ ہلکے پھلکے الفاظ، عام فہم زبان سادہ فقرے لکھتے ہیں۔ اور سادہ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ طنز سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ اور اس کے پردے میں حقیقتیں بیان کرتے ہیں، غالب کے پرستار ہیں چنانچہ اپنے پہلے مجموعے کا نام وہیں سے لیا ہے اور اس کی تقلید میں باقی مجموعوں کے نام رکھتے ہیں۔ "پروفیسر دانش" آپ کا ایک شاہکار ہے اس میں کچھ تلخ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

دعوت کروں۔ مگر کبھی اپنی خواہش کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوست ہیں۔ وہ آتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو متوجہ ہو کر نہیں سنتے یا اخبار اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں یا گانے لگتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو آتے ہیں اپنی ہی کہے جاتے ہیں، میری نہیں سنتے۔

یہ سب میرے عنایت فرما اور خیر طلب ہیں مگر اپنی طبیعت کو کو کیا کروں صاف صاف کہتا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کہہ سکتا ہوں ؎

"مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا"

اب چونکہ میں نے یہ لکھنا شروع کر دیا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اور احباب کے متعلق اپنے دلی خیالات ظاہر کر دوں۔ دروازے پر ایک گاڑی آ کے رکی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ کون صاحب تشریف لائے ہیں۔ میں ان کی شکایت نہیں کرنے کا۔ کیونکہ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ تین گھنٹے سے میں یہ مضمون لکھ رہا تھا کہ کسی کرم فرمانے کرم نہیں فرمایا۔ اس لیے اس کے شکریے میں میں اس مضمون کو اسی ناتمام حالت میں چھوڑتا ہوں۔ اور اپنے دوست کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ یہ دوست میری صحت کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ جب آتے ہیں مجھ پر اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں کہ تم اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت بھی یہ کسی نئے حکیم یا ڈاکٹر کا حال سنائیں گے۔ جو بڑا حاذق ہے یا کوئی مجرب نسخہ میرے لیے کسی سے مانگ کر لائے ہوں گے۔

"آیئے آیئے، مزاج عالی، بہت دن بعد تشریف لائے"

(ملخص)

چاہتا تھا کہ پھر وہی دستک ؛
نوکر اطلاع دیتا ہے کہ گاڑی تیار ہے، سرکار کپڑے پہنے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں فوراً پیچھے جاتا ہوں تو پہلا فقرہ جو میزبان صاحب کہتے ہیں، یہ ہوتا ہے! آج دستے کے دستے لکھ ڈالے" میں سچی بات کہوں کہ "کچھ بھی نہیں لکھا" وہ ہنس کے جواب دیتے ہیں کہ "آخر اس قدر کسر نفسی کی کیا ضرورت ہے؟" ؎

خدا کے واسطے جھوٹی نہ کھائیے قسمیں
مجھے یقین ہوا مجھ کو اعتبار آیا

ہل ملا کر شام کو واپس آئے، کھانے کے بعد باتیں ہوئیں میں سونے کے وقت اپنا دن بھر کا کام اٹھا کر دیکھتا ہوں تو ایک صفحے سے زیادہ نہیں، وہ بھی بے ربط و بے سلسلہ، غصے اور رنج میں آکر اسے پھاڑ کر پھینک دیتا ہوں۔ اور دوسرے روز اپنے میزبان کو ناراض کر کے اپنے گھر واپس چلا جاتا ہوں۔ میں ناشکرا اور احسان فراموش کہا جاؤں گا۔ مگر میں مجبور ہوں، اس عزیز اور مہربان دوست کو بھی چھوڑ دوں گا۔

میں نے ذرا تفصیل سے ان کا حال بیان کیا ہے۔ مگر یہ خیال نہ کرنا کہ میں ان احباب کی فہرست ختم ہو گئی۔ جن سے میں رخصت طلب کر سکتا ہوں؟ ابھی بہت سے باقی ہیں۔ مثلاً ایک صاحب ہیں جو مجھ سے کبھی نہیں ملتے، مگر جب آتے ہیں، میں ان کا مطلب سمجھ جاتا ہوں۔ یہ حضرت ہمیشہ قرض مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو ہمیشہ ایسے وقت آتے ہیں جب میں باہر جانے والا ہوتا ہوں۔ ایک صاحب ہیں جب مجھ سے ملتے ہیں، کہتے ہیں "میاں! عرصے سے میرا دل چاہتا ہے تمہاری

"کیا ہے؟"

"سرکار کہتے ہیں اگر آپ تھوڑی دیر میں کھائیں گے تو ہم بھی اسی وقت کھائیں گے۔ مگر کھانا ٹھنڈا ہو کے بالکل خراب ہو جائے گا۔"

"اچھا بھائی لو ابھی آیا۔"

یہ کہہ کے میں کھانے کے لئے جاتا ہوں۔ سب سے معذرت کرتا ہوں، میزبان نہایت اخلاق سے فرماتے ہیں:۔ "چہرے پر تھکن معلوم ہوتی ہے۔ کیا بہت لکھ ڈالا۔ دیکھو میں تم سے کہتا تھا کہ شہر میں ایسی فرصت اور خاموشی کہاں؟"

سوائے اس کے کہ آمنّا و صدّقنا کہوں اور کیا کہہ سکتا تھا؟ اب کھانے پہ اصرار ہوتا ہے۔ جس چیز سے مجھے رغبت نہیں وہی کھلائی جاتی ہے۔ بعد کھانے کے، میزبان صاحب فرماتے ہیں:۔ "سہ پہر کو تمہیں گاڑی میں چلنا ہوگا۔ میں تمہیں اس واسطے یہاں نہیں لایا کہ سخت دماغی کام کر کے اپنی صحت خراب کر لو۔"

واپس کمرے میں تھوڑی دیر اس غرض سے لیٹتا ہوں کہ خیالات جمع کر لوں اور پھر لکھنا شروع کر دوں۔ مگر اب خیالات کہاں؟ مضمون اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" اس کے متعلق کیا لکھنے والا تھا؟ ان الفاظ کے بعد کون سے الفاظ دماغ میں تھے؟ اب کچھ خیال نہیں کہ اس کو پہلے فقروں سے کیونکر ربط پیدا کرتا تھا، یونہی پڑے پڑے نیند آجاتی ہے۔ تیسرے پہر اٹھتا ہوں تو دماغ نہایت صحیح پاتا ہوں۔ "زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ" بالکل حل ہو جاتا ہے۔ پورا فقرہ آئینہ کی طرح صاف نظر آتا ہے۔ میں خوشی خوشی اُٹھ کر میز پر گیا۔ اور لکھنا

لکھ رہا تھا۔

"ہم کو یقین کامل ہے کہ ہمارے ملک کے قابل نوجوان جنہیں تفتیش اور تحقیقات کا شوق ہے۔ اور جو کولمبس کی طرح نئی معلومات اور نئی دنیا (کودہ علمی دنیا ہی کیوں نہ ہو) کے دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں....."

دروازہ پر دستک۔

"کیا ہے"؟

"اچھا"

"اور دریافت کرنے کے لئے اپنے تئیں خطرے میں ڈالنے سے بھی خوف نہیں کھاتے، ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے۔ اور اپنی کاوشوں، اور کوششوں سے موجودہ....."

دروازہ پھر کھٹکھٹایا گیا۔

"ہاں"

"حضور! سرکار آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے"

افوہ! مجھے خیال نہیں رہا۔ سرکار سے عرض کرنا میرا انتظار نہ کریں میں پھر کھالوں گا۔ اس وقت مجھے کچھ ایسی بھوک نہیں۔

"اور آئندہ نسلوں کو زیر بار احسان کریں گے۔ یہی نوجوان ہیں جو قوم کی کشتی کو خدا کی مدد پر بھروسہ کر کے خطرات سے بچاتے اور ساحل مراد تک پہنچاتے ہیں۔ زندگی اور موت کا لاینحل مسئلہ"

"دستک"

کسی دوست سے کہے ہیں۔ جو ابھی اُن سے ملنے آیا ہے میں مصروفیت میں انہیں ہی لکھ گیا۔

ہاں تو کاٹ کے نقرہ درست کرنا چاہیئے۔" اور جن کی قدر ابھی تک ملک و قوم کو معلوم نہ ہوئی اور بظاہر.....

کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں شیخ! سرکار نے کہا ہے کہ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو نیچے ذرا سی دیر کے لئے تشریف لائیے۔ کوئی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ اور سرکار انہیں آپ سے ملانا چاہتے ہیں۔"

بادل ناخواستہ میں اٹھا اور نیچے گیا۔ شاکر صاحب کے دوست اجمل طالب علی صاحب تشریف لائے تھے۔ ان سے میرا تعارف کرایا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تشریف لے گئے اور مجھے بھی فرصت ملی۔ اور میں نے یکسو ہو کر لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ شیخ نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ میری پھر یاد ہوئی۔ ہمارے میزبان کے کوئی اور دوست آئے ہوئے ہیں اور میں انہیں دکھایا جاؤں گا۔ گویا میں بھی مثل اس عربی گھوڑے کا تھا۔ جسے میزبان نے حال ہی میں خریدا تھا اور جو ہر دوست کو اصطبل سے منگا کے دکھایا جاتا تھا۔ ان دوست سے نجات پا کر اور بھاگ کر پھر میں اپنے کمرے میں آیا۔ خیالات غائب ہو گئے تھے۔ نقرہ از سر نو پھر بنانا پڑا۔ طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ بہزار وقت پھر بیٹھا اور لکھنا شروع کیا۔ اب کی مرتبہ خوش قسمتی سے کوئی آدھ گھنٹہ ایسا ملا۔ جس میں کوئی آیا گیا نہیں۔ اب میرا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔ اور میں

"ارے میرے خیالات، تمہیں میرا گنجینہ، میرا خزانہ ہو، خدا کے لئے رحم کرو میرے دماغ میں پھر آجاؤ" یہ کہہ کے میں کاغذ کی طرف متوجہ ہوا۔ کہ دیکھوں کہاں چھوڑا ہے۔ میں اس فقرے تک پہنچا تھا:۔

"ہم اس وسیع اور دقیق مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں۔ اتنا ہی اس کی مشکلات کا مثل....."

مثل کے آگے میں کیا لکھنے والا تھا؟" ریگ دریا کے اندازہ نہیں کر سکتے؟" ایسا معمولی فقرہ تو نہ تھا، مجھے یقین ہے کہ کچھ اور تھا۔ کوئی اعلیٰ درجے کی تشبیہ اور فقرے کو نہایت شاندار الفاظ میں ختم کرنے والا تھا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کیا فقرا کیا نہ تھا۔ اب تو دماغ میں اس کا پتا بھی نہیں۔ گانے والے صاحب تو شکایت کر رہے تھے کہ۔

اس کی گلی سے آئے کیوں؟ شکہت زلف لائے کیوں
مجھ کو صبا سے ہے امید! مجھ سے صبا کو کیا غرض

مگر میرا تو صبا کے نام نے دماغ خالی کر دیا۔ اگر وہ آتی اور شکہت زلف بھی لاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔ بہر حال اب مجھے وہ فقرہ از سر نو درست کرنا چاہیئے۔ مشکلات کی بجائے کچھ اور ہونا چاہیئے۔

"ہم اس وسیع مضمون پر جتنا غور و فکر کرتے ہیں۔ اتنا ہی ان بیش بہا علمی جواہر کو جو ہمارے ملک اور قوم کے علمی خزانے کو پُر کرنے کے لئے کافی ہیں اور جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے؟"

"جن کی قدر آپ کہاں بھول پڑے، اتنے دنوں کہاں رہے۔ یہ کیا مہمل فقرہ ہوا! لاحول ولا قوۃ میں بھی کیا گڑبڑ کر رہا ہوں۔ آپ کہاں بھول پڑے اتنے دنوں کہاں رہے" یہ فقرے تو شاکر صاحب نے

میری مدد کی تھی اور میرے پرّاں خیالات کو تیزی کے ساتھ قفس کاغذ میں بند کیا تھا، نکالا اور لکھنا شروع کیا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مرغانِ خوش نوا کی تعریف میں شعراء اس قدر طب اللسان ہیں ان کی عنایت سے میں خوش نہیں ہوا کہ سب کے سب میرے کمرے کے نیچے درخت پر جمع ہو گئے۔ اور شور مچانا شروع کر دیا۔ تاہم میں نے کوشش کر کے ان کی طرف سے کانا بند کر لیئے اور کام میں ہمہ تن مشغول ہو گیا۔

تن تن، تنتنانا، چھن تن تن، تن، تن، میں ایسا مصروف تھا کہ دنیا اور مافیہا کی خبر نہ تھی۔ یکایک، اس تن تن نے چونکا دیا۔ یہ کیا ہے؟، افوہ! اب میں سمجھا، میرے کمرے کے قریب شاکر خاں صاحب کے چھوٹے بھائی کا کمرہ ہے! انہیں موسیقی میں بہت دخل ہے۔ اس وقت ستار سے شوق فرما رہے ہیں۔ بہت خوب بجا رہے ہیں۔

اس کی گلی سے اٹھے کیوں؟ نکہت زلف لائے کیوں"
مجھ کو صبا سے ہے اُمید؟ اہا مجھ کو صبا سے ہے اُمید"
مجھ سے صبا کو کیا غرض؟"

واہ وا! سبحان اللہ کیا غزل چھیڑی ہے۔

"اے ترک سوار ناقۂ غرب نگری پہنچا دینا۔
کس رنگ میں ہے وہ حبیب مرا، مجھے واں کی خبر پا لا دینا۔

بہت ہی خوب! کمال کرتے ہیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ انہوں نے موسیقی کی مشق فرما کر مجھے میری خواہش کے خلاف محظوظ فرمایا۔ پھر کسی وجہ سے وہ اپنے کمرے سے چلے گئے۔ اور خاموشی طاری ہو گئی۔ تو مجھے پھر اپنے کام کا خیال آیا۔

میں نیچے ناشتہ کی غرض سے بلایا گیا۔ جب دوسرا پیالہ چائے کا پی چکا تو اپنے کمرے کو جانے کے لئے اٹھا ہی تھا کہ چاروں طرف سے اصرار ہونے لگا کہ ہیں ہیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا کہ آج ہی سے کام شروع کر دو، اپنے دماغ کو کچھ تو آرام دو۔ اور آج کا دن تو خاص کر اس قابل ہے کہ سینری کا لطف اٹھانے میں گزارا جائے۔ چلئے گاڑی تیار کراتے ہیں۔ دریا پر مچھلی کا شکار کھیلیں گے۔ پھر وہاں سے دو میل پر احمد نگر ہے۔ آپ کو وہاں کے رئیس راجہ طالب علی صاحب سے ملائیں گے۔"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ اگر یہی حال رہا تو یہاں بھی فرصت نہیں۔ خیر سینکڑوں حیلے حوالوں سے اس وقت تو میں بچ گیا۔ اور میرے میزبان بھی میری وجہ سے نہ گئے۔ مگر مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جس عنقا یعنی یکسوئی کی تلاش میں میں سرگرداں تھا۔ وہ مجھے یہاں بھی نہ ملے گی۔

میں جلدی اٹھ کر اپنے کمرے میں آیا اور اس وقت ذرا غور سے اس میز کے سامان کو دیکھا، جو میرے لکھنے پڑھنے کے لئے تیار کی گئی تھی۔ میز پر نہایت قیمتی کامدار کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جس پر سیاہی کا ایک قطرہ گرانا گناہ کبیرہ سے کم نہ ہوگا۔ چاندی کی دوات، مگر سیاہی دیکھتا ہوں تو سوکھی ہوئی۔ انگریزی قلم نہایت قیمتی اور نایاب، مگر اکثر میں نب ندارد جاذب نظر کاغذ ایک مخملی جلد کی کتاب میں۔ مگر لکھنے کے کاغذ کا پتا نہیں۔ اسی طرح بہت اعلیٰ درجے کا بیش قیمت سامان میز پر تھا۔ مگر اکثر اس میں میرے کام کا نہیں، اور جو چیزیں کہ ضرورت کی تھیں، وہ موجود نہیں۔ آخر کار میں نے اپنا وہی پرانا استعمالی مگر مفید بکس، اور اپنی معمولی دوات اور قلم (جس نے اب تک نہایت ایمانداری سے

یا مذمت کے سوا، تعریف اس حالت میں جبکہ انہوں نے مقدمہ جیتا ہو اور کوئی مضمون نہیں۔ منجملہ اور بہت سے مختلف قسموں کے دوستوں کے میں محمد شاکر خاں صاحب کا ذکر خصوصیت سے کروں گا۔ کیونکہ وہ مجھ پر خاص عنایت فرماتے ہیں۔ شاکر خاں صاحب موضع سلیم پور کے رئیس اور ضلع بھر میں نہایت معزز آدمی ہیں۔ انہیں اپنی لیاقت کے مطابق لٹریچر کا بہت شوق ہے۔ لٹریچر پڑھنے کا اتنا نہیں جتنا لٹریری آدمیوں سے ملنے اور تعارف پیدا کرنے کا، ان کا خیال ہے کہ اہل علم کی تھوڑی سی قدر کرنا امراء کے شایان شان ہے ایک مرتبہ میرے ہاں تشریف لائے اور بہت اصرار سے مجھے سلیم پور لے گئے۔ یہ کہہ کے!

"شہر میں رات دن شور و شغب رہتا ہے۔ دیہات میں کچھ عرصہ رہنے سے تبدیل آب و ہوا بھی ہوگی اور وہاں مضمون نگاری بھی زیادہ اطمینان سے کر سکو گے۔ میں نے ایک کمرہ خاص تمہارے واسطے آراستہ کرایا ہے۔ جس میں پڑھنے لکھنے کا سب سامان مہیا ہے۔ تھوڑے دن رہ کے چلے آنا۔ دیکھو میری خوشی کرو۔"

میں ایسے محبت آمیز اصرار پر انکار کیسے کر سکتا تھا؟ مختصر سا سامان پڑھنے لکھنے کا لے کر میں ان کے ساتھ ہو لیا۔ ایڈیٹر "معارف" سے وعدہ کر چکا تھا کہ ایک خاص عرصہ میں ان کی خدمت میں ایک مضمون بھیجوں گا۔ شاکر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ کر میں نے وہ کمرہ دیکھا جو میرے لئے تیار کیا گیا تھا۔ یہ کمرہ کوٹھی کی دوسری منزل میں تھا اور نہایت خوبی سے آراستہ تھا۔ اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی تھی۔ اور ایک نہایت ہی دلفریب نیچرل منظر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا تھا۔ صبح کو

بھائیوں کی طرح محبت کرتے ہیں۔ تاہم میں انہیں چھوڑ دوں گا۔ اگرچہ کلیجے پر پتھر رکھنا پڑے۔

اب لیجئے دوسرے دوست محمد تحسین ہیں۔ یہ بال بچوں والے صاحب ہیں۔ اور رات دن انہیں کی فکر میں رہتے ہیں۔ جب کبھی ملنے آتے ہیں تو تیسرے پہر کے قریب آتے ہیں۔ جب میں کام سے فارغ ہو کر چلتا ہوں۔ لیکن اس قدر تھکا ہوا ہوتا ہوں کہ دل یہی چاہتا ہے کہ ایک گھنٹہ آرام کرسی پہ خاموش پڑا رہوں۔ مگر تحسین آئے ہیں اور ان سے ملنا ضروری ہے۔ ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے سوائے اپنی بیوی بچوں کی بیماری کے اور کوئی مضمون ہی نہیں۔ میں کتنی ہی کوشش کروں۔ مگر اس مضمون سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر میں موسم کا ذکر کرتا ہوں۔ تو وہ کہتے ہیں ہاں بڑا خراب موسم ہے۔ میرے چھوٹے بچے کو بخار آگیا ہے، منجھلی لڑکی کھانسی میں مبتلا ہے۔ اگر پالیٹکس یا لٹریچر کے متعلق گفتگو شروع کرتا ہوں۔ تو تحسین صاحب فوراً معذرت پیش کرتے ہیں کہ بھائی آج کل گھر بھر بیمار ہے مجھے اتنی فرصت کہاں کہ اخبار پڑھوں۔ اگر کسی عام جلسے میں آتے ہیں تو اپنے لڑکوں کو ضرور ساتھ لئے ہوتے ہیں۔ اور ہر ایک سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ طبیعت تو نہیں گھبراتی؟ پیاس تو نہیں معلوم ہوتی؟ کبھی کبھی نبض دیکھ لیتے ہیں اور وہاں بھی کسی سے ملتے ہیں تو گھر کی بیماری ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح میرے مقدمے باز دوست ہیں جنہیں اپنی ریاست کے جھگڑوں اپنے فریق مخالف کی برائیوں اور جج صاحب کی تعریف

چیخنا شروع کر دیتے ہیں کہ کم بخت کو اپنی صحت کا بھی تو خیال نہیں (نوکر کی طرف مخاطب ہو کر) خیراتی! کب سے کام کر رہے ہیں؟ بڑی دیر سے؟ توبہ توبہ! اچھا بس میں ایک منٹ اُن کے پاس بیٹھوں گا۔ مجھے خود جانا ہے۔ چھت پر ہوں گے نا۔؟ میں پہلے ہی سمجھتا تھا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ اوپر آتے ہیں اور دروازہ اس زور سے کھولتے ہیں کہ گویا کوئی طوفان آ کر لگا۔ (آج تک انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا نہیں اور آندھی کی طرح داخل ہوتے ہیں)

"ہا ہا ہا ہا! آخر تمہیں میں نے پکڑ لیا۔ مگر دیکھو دیکھو میری وجہ سے اپنا لکھنا بند مت کرو۔ میں حرج کرنے نہیں آیا۔ خدا کی پناہ! کس قدر لکھ ڈالا ہے۔ کہو طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنے آیا تھا۔ واللہ مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے کہ میرے دوستوں میں ایک شخص ایسا ہے۔ جو مضمون نگار کے لقب سے پکارا جا سکتا ہے۔ تو اب جاتا ہوں، میں بیٹھوں گا نہیں۔ ایک منٹ ٹھہرنے کا نہیں۔ تمہاری خیریت دریافت کرنی تھی۔ خدا حافظ۔" یہ کہہ کر وہ نہایت محبت سے مصافحہ کرتے ہیں۔ اور اپنے جوش میں میرے ہاتھ کو اس قدر دبا دیتے ہیں کہ انگلیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور میں قلم نہیں پکڑ سکتا۔ یہ تو علیحدہ رہا اپنے ساتھ میرے کل خیالات کو بھی لے جاتے ہیں۔ خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر اب وہ کہاں؟ اور دیکھا جائے تو میرے کمرے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں رہے۔ تاہم وہ گھنٹوں رہتے تو اس سے زیادہ نقصان نہ کرتے، کیا میں انہیں چھوڑ سکتا ہوں؟ میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میری اُن کی دوستی بہت پرانی ہے۔ اور وہ مجھ سے

کیا اس پر بھی وہ شکر ادا نہیں کرتا؟ خدا جانے وہ اور کونسی نعمت چاہتا ہے؟ لوگ کہیں گے کہ اس شخص کے کیسے بیہودہ خیالات ہیں! بغیر دوستوں کے زندگی دوبھر ہوتی ہے اور یہ اُن سے بھاگتا ہے۔ مگر میں دوستوں کو برا نہیں کہتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھے خوش کرنے کے لئے میرے پاس آتے ہیں اور یہ میرے خیر طلب ہیں۔ مگر عملی نتیجہ یہ ہے کہ احباب کا ارادہ ہوتا ہے، مجھے فائدہ پہنچانے کا اور ہو جاتا ہے، مجھے نقصان، چاہے مجھ پر لعنتیں کی جائیں۔ مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آج تک میرے سامنے کوئی نہایت نہ کر سکا کہ احباب کا ایک جم غفیر رکھنے اور شناسائی کے دائرے کو وسیع کرنے سے کیا فائدہ ہے، کیا تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر دنیا میں کچھ کام کرنا ہے اور باتوں ہی میں عمر نہیں گزارنی ہے، تو بعض نہایت عزیز دوستوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ چاہے اس سے میرے دل پر کیا ہی صدمہ ہو۔

مثلاً میرے دوست اخوند مرزا ہیں جنہیں میں بھر بھر یا دوست کہتا ہوں۔ یہ نہایت معقول آدمی ہیں اور میری ان کی دوستی نہایت پرانی اور بے تکلفی کی ہے۔ مگر حضرت کی خلقت میں یہ داخل ہے کہ دو منٹ نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ جب آئیں گے شور مچاتے ہوئے چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے۔ غرض کہ اُن کا آنا بھونچال کے آنے سے کم نہیں ہے جب وہ آتے ہیں تو میں کہتا ہوں۔

"کوئی آرہا ہے، قیامت نہیں ہے" اُن کے آنے کی مجھے دور سے خبر ہو جاتی ہے۔ باوجودیکہ میرے لکھنے پڑھنے کا کمرہ چھت پر ہے اگر میرا نوکر کہتا ہے کہ "میاں اس وقت کام میں مشغول ہیں" تو وہ فوراً

میں اپنے دل میں یہ باتیں کرتا ہوا مکان پر آیا۔ کیسا خوش قسمت آدمی ہے۔ کہتا ہے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خوش نصیب شخص یہیں تو تو مجھ سے بڑھ گیا۔ لیکن کیا اس کا یہ قول صحیح بھی ہے؟

یعنی کیا اصل میں اس کا کوئی دوست نہیں، جو میرے دوستوں کی طرح اسے دن میں پانچ منٹ کی بھی فرصت نہ دے۔ میں اپنے مکان پر ایک مضمون لکھنے جا رہا ہوں۔ مگر خیر نہیں کہ مجھے ذرا بھی وقت ایسا ملیگا کہ میں بچلے میں اپنے خیالات جمع کر سکوں اور انہیں اطمینان سے قلم بند کر سکوں۔ یا جو اسپیچ مجھے کل دینی ہے۔ اسے سوچ سکوں۔ کیا یہ فقیر دن دھاڑے اپنا روپیہ لے جا سکتا ہے اور اس کا کوئی دوست راستے میں نہ ملے گا۔ اور یہ نہ کہے گا۔

بھائی جان! دیکھو پرانی دوستی کا واسطہ دیتا ہوں مجھے اس وقت ضرورت ہے، تھوڑا سا روپیہ قرض دو۔ کیا اس کے احباب وقتاً فوقتاً بے وقت اسے دعوتوں اور جلسوں میں کھینچ کر نہیں لے جاتے۔ کیا کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اسے نیند کے جھونکے آ رہے ہوں۔ مگر یار دوستوں کا مجمع ہے جو قصے پہ قصہ اور لطیفے پہ لطیفہ کہہ رہے ہیں۔ اور اٹھنے کا نام نہیں لیتے؟ کیا اسے دوستوں کے خطوط کا جواب نہیں دینا پڑتا؟ کیا اس کے پیارے دوست کی تصنیف کی ہوئی کوئی کتاب نہیں جو اسے خواہ مخواہ پڑھنی پڑے اور ریویو لکھنا پڑے؟ کیا اسے احباب کی وجہ سے شور مچانا اور ہوحق کرنا نہیں پڑتا؟ کیا دوستوں کے ہاں ملاقات کو اسے جانا نہیں پڑتا۔ اور اگر نہ جائے تو کوئی شکایت نہیں کرتا۔ اگر ان سب باتوں سے وہ آزاد ہے۔ تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ موٹا تگڑا ہے اور میں نحیف و نزار ہوں۔ یا اللہ

میں آفت کا مارا۔ سات بچوں کا باپ ہوں۔ اب روٹیوں کو محتاج ہوں۔ اور اپنی مصیبت ایک ایک سے کہتا ہوں۔ میں بھیک نہیں مانگتا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے وطن کو چلا جاؤں۔ مگر کوئی خدا کا پیارا مجھے گھر بھی نہیں پہنچاتا۔ بھائی مسلمانو! میں غریب الوطن ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔ ہائے میرا کوئی دوست نہیں۔ اے خدا کے بندو میری سنو میں غریب الوطن ہوں۔"

فقیر تو یہ کہتا ہوا اور جن پر اس کے قصے کا اثر ہوا ان کی خیرات لیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ لیکن میرے دل میں چند خیالات پیدا ہوئے اور میں نے اپنی حالت کا مقابلہ اس سے کیا اور مجھے خود تعجب ہوا کہ اکثر امور میں میں نے اس کو اچھا پایا۔ یہ صحیح ہے کہ میں کام کرتا ہوں اور وہ مفت خوری سے دن گزارتا ہے۔ نیز یہ کہ میں نے تعلیم پائی ہے اور وہ جاہل ہے۔ میں اچھے لباس میں رہتا ہوں۔ وہ پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ بس یہاں تک میں اس سے بہتر ہوں۔ آگے بڑھ کر اس کی حالت مجھ سے بدرجہا اچھی ہے۔ اس کی صحت پر مجھے رشک کرنا چاہیئے۔ میں رات دن فکر میں گزارتا ہوں۔ اور وہ ایسے اطمینان سے بسر کرتا ہے کہ باوجود بسورنے اور رونے کی صورت بنانے کے اس کے چہرے سے بشاشت نمایاں تھی۔ بڑی دیر تک غور کرتا رہا کہ اس کی یہ قابل رشک حالت کس وجہ سے ہے؟ اور آخر کار میں اس بظاہر عجیب نتیجے پر پہنچا کہ جسے وہ مصیبت خیال کرتا ہے وہی اس کے حق میں نعمت ہے۔ وہ حسرت سے کہتا ہے کہ "میرا کوئی دوست نہیں۔ میں حسرت سے کہتا ہوں "میرے اتنے دوست ہیں"۔ اس کا کوئی دوست نہیں؟ اگر یہ سچ ہے، تو اسے مبارک باد دینی چاہیئے۔

سید سجاد حیدر یلدرم

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ

ایک مضمون نگار کی شکایت احباب سے

اور کوئی ظلم اپنائے زمانہ سے نہیں
مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا

ایک دن میں دلی کے چاندنی چوک میں سے گزر رہا تھا کہ میری نظر
ب فقیر پر پڑی جو بڑے ہی دلچسپ طریقے سے اپنے حالات زار لوگوں سے بیان کرتا
رہا تھا۔ دو تین منٹ کے وقفے کے بعد یہ درد بھری آواز صحیح اپنی الفاظ
کی سی پیرایہ میں دہرا دی جاتی تھی۔ یہ طرز بیان مجھے کچھ ایسا خاص معلوم ہوا
کہ میں اس شخص کو دیکھنے اور اس کے الفاظ سننے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس فقیر
کا قد لمبا جسم خوب موٹا تازہ تھا۔ اور چہرہ ایک حد تک خوب صورت ہوتا
اگر بدمعاشی اور بے حیائی نے صورت مسخ کر دی تھی۔ یہ تو اس کی شکل تھی
اور اس کی صدا تو میں ایسا سنی القلب ہستیوں ہوں کہ صرف اس کا مختصر سا خلاصہ
بیان کر دوں۔ وہ اس قابل ہے کہ نقطہ بہ نقطہ لکھی جائے۔ چنانچہ وہ اصحیح یا
غلط جو کچھ کہتے یہ تھی۔

"اے بھائی مسلمان خدا کے لئے مجھ غریب کو احسان مند کرو۔

سید سجاد حیدر یلدرم!

سید سجاد حیدر ۱۸۸۰ء میں بجنور ضلع کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے بی اے کیا اور ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔ کئی بار ترکی، شام اور دوسرے ملکوں کی سیاحت کی، کچھ عرصے تک مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے رجسٹرار بھی رہے۔ ملازمت پانے کے بعد راجہ صاحب محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے۔ آخر ۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

طالب علمی کے زمانے ہی میں آپ کا شمار ممتاز ادیبوں اور شاعروں میں ہونے لگا تھا۔ کئی مضامین، افسانے، ڈرامے اور نظمیں لکھی ہیں، جن کے مجموعے "خیالستان" "حکایات و احساسات" "جلال الدین خوارزم شاہ" اور "ثالث بالخیر" بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ترکی ادب پر آپ کی گہری نظر تھی۔ ترکی اور انگریزی سے ترجمے بھی کئے۔ آپ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ اردو نثر میں ایک نئے انداز کے موجد جسے روایت کہتے ہیں۔ آپ کے طرز بیان میں بڑی بے ساختگی، لطافت اور روانی موجود ہے۔ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ نئی نئی ترکیبیں ڈھالتے ہیں اور ادب لطیف کے امام ہیں۔

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" ایک انگریزی مضمون کا چربہ ہے۔ جو آپ ہی کے ذہن کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ اس میں آپ نے دوستوں کی قسمیں گنائی ہیں۔ اور دوستی پر طنز کیا ہے۔ یہ آپ کا شگفتہ افسانہ نما مضمون ہے۔

بس اب تم سوتے رہو۔"

"ہم تو سو چکے تھے۔ آپ کو ہی تو سنا رہے تھے۔ پنڈت جی۔"

"آنکھیں بھی جا رہی ہیں۔"

"ہاں ہاں آرام فرمایئے آپ۔"

"ہاں بس اب لیٹوں گا۔ وہ دودو۔ تم پان اور پانی ہمارے سرہانے رکھ دینا اور للو یہاں سے اٹھ کر حقہ بھی ہمارے پلنگ کے ساتھ رکھ آنا۔ صبح ضرورت ہوگی ہمیں۔ مگر دیکھنا چلم باہر الگ لینا اور للو وہ دوا ہماری رکھنا نہ بھول جانا اور شاید یہ اگالدان بھی تو ہمارے ہی کمرے کا ہے۔ یہاں۔ یہ اپنے ٹھکانے پہ پہنچ جائے۔ سمجھ لینا۔"

"چچا میاں اتنی دیر میں تو رات ختم ہو جاتی۔"

"چچا اصرار سے کچھ چڑ گئے بولے "ہوتی تو ہو جاتی! اچھا ہم کیا کریں، بات نہ ہوئی مذاق ہی ہو گیا۔"

مایوس ہو کر مجھے اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ پکار پکار کر کہوں؟ وہ چچا میاں وہ آم کی گٹھڑی اصل میں پنڈت جی ہی کی ملازمہ کی تھی گھر جا کر بھید کھلا اور پھر یہ دوہرا آم بھیجنے پہ پچھتائے۔

"ہماری بلا سے"

یہ کہہ کر چچا زور سے دروازہ بند کر اندر چلے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اصرار سے وہ اور کھنچ گئے۔ ان کے جانے کے بعد کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔ پہلی مرتبہ ہمیں احساس ہوا کہ کلاک چل رہا ہے۔

نہیں سمجھے۔ وہ بات یہ ہے کہ جلد سو رہنے اور صبح جلد اٹھنے کا عادی ہوں۔
تاہم کیا ہوا۔ آپ شوق سے فرمایئے۔
پنڈت جی بیچارے کھوئے کھوئے ایک مردہ تبسم سے پھر گویا
ہوئے بات تو شروع تعزیت کے لیے کی گئی تھی۔ یہ حالت یہ تھی کہ کوئی باہر
سے آتا تو اسے قطعی طور سے یہ معلوم ہوتا کہ پنڈت جی سے کوئی بہت بڑا
جرم ہو گیا ہے جس کے لئے یہ غریب بچا چھکن سے معافی مانگ رہے ہیں۔
"گارڈ کے جانے کے بعد ہمیں فکر ہوئی کہ اول تو چوری کا مال کھایا
اور پھر اس پر یہ شرارت کہ اس کی خبر گارڈ کو بھی۔ اب اگر کوئی جھگڑا اٹھا
اور باقی آم اور کپڑا ہمارے پاس سے نکلا تو خاصا چوری کا مقدمہ بن جائے گا
بچا چھکن کی جبالی، چنانچہ یہ سوچا کہ جو آم باقی ہیں انہیں چپکے سے کھینک
دیا جائے۔ تاکہ کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ہم نے آم اور دو تین دوسرے
جس میں وہ بندھے ہوئے تھے۔ لیٹ کر خلیتی گاڑی سے باہر پھینک دیئے۔
بچا چھکن کی جبالی جس کے خیر میں کچھ اس قسم کا شر تھا جیسے منہ پھاڑے
وقت کٹتا ہے، تھوڑی دیر بعد ہمارا سفر ختم ہو گیا۔ ہم مراد آباد اتر کر اپنے گھر پہنچے۔
بچا اٹھ کھڑے ہوئے۔ بھئی" ہمیں تو نیند آ گئی۔ پنڈت جی قصہ تو بڑا
دلچسپ تھا مگر بقول آپ کے ایسی کونسی ضروری بات ہے کہ اسے
ختم ہی کیا جائے۔ میں تو معافی چاہتا ہوں۔ آپ نہیں سنائیے آپ"
ذرا سی بات باقی رہ گئی تھی۔ سب نے کہا "بچا میاں۔ بس
ذرا سی بات باقی ہے۔ اب سن ہی لیجئے"
"نہ بھئی اب تو سوئیں گے ہی ہم"
"دو نیند ہی تو فقرے ہیں"

ادا کریں گے وہاں پہنچے تو ہماری شرافت کا خیال فرمائیے کہ ریل والوں کو صاف کہہ دیا کہ بھائی لوگوں ہمارا ٹکٹ مراد آباد تک کا تھا۔ باقی تمہارا جو کچھ ہمارے ذمے نکلتا ہو۔ اب لے لو۔ لیجئے صاحب وہ تو اکڑ گئے۔ کہیں کہ ہم تو دنگا کرایہ لیں گے۔ ہمارا تو حق یہی ہے۔ بہتیرا سمجھایا۔ لڑے جھگڑے منت خوشامد کی مگر بے سود۔ مجبوراً دونا کرایہ ادا کرکے خلاصی ہوئی تو میرا یہ بیان کرنے سے مطلب یہ کہ ریل والے جب ستانے پر تل جائیں تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ چچا حقہ پینے میں لگے۔ محفل پر ایک ہلکا سا سکوت چھا گیا۔ پنڈت جی کی اب یہ کیفیت گویا کسی نشے سے دماغ سن ہو گیا ہے۔ ہم سب کی عجیب حالت۔ داستان جاری رکھنے کو کہیں تو قطع کلام کا ڈر خاموش ہو رہیں تو یہ شرمندگی کہ پنڈت جی کی بات ادھ بیچ میں رہ گئی۔ اتنے میں چچا چھکن نے کھنکیاں اٹھا اٹھا کر انگڑائیاں اور جمائیاں لینی شروع کر دیں۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھی۔ کہ چچا اب زیادہ دیر یہ بیٹھیں گے۔ اور بات شاید جلد ختم ہو سکے چنانچہ ہلکے سے کہہ دیا۔ "جی پنڈت جی پھر؟"

چچا نے ایک نئی جمائی لے کر کہا۔ "ختم نہیں ہوئی ابھی بات؟ تو پھر کہو۔ ارے جلدی سے اب تو کچھ خدا کا خوف کرو۔ کیا وقت ہو گیا ہو گا؟ سوا گیارہ۔ اتوبہ۔ دیکھئے تو بات چیت میں وقت کیسے جلدی گذر جاتا ہے ہاں تو کیا رہ گیا تھا اب؟"

پنڈت جی کے لئے ایسی حالت میں بات کہنے کے سوا چارہ نہ تھا کہ ایسی کونسی ضروری بات ہے کہ اسے ختم ہی کیا جائے۔ نیند آ رہی ہے تو آپ اب آرام فرمائیے۔

چچا چھکن نہ مانے بولے "نہ بات ختم کر لیجئے آپ۔ ایسی جلدی

سی آواز میں پھر داستان شروع کر دی بولے "میں نے گاڑی کو اطمینان دلایا کہ اب ایسی حرکت نہ ہوگی چنانچہ وہ ہم پر بگڑ بگڑ کر رخصت ہو گیا۔۔۔ اب۔"

"چلا گیا؟" تو یوں کہیے رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ بعض اوقات تو یہ لوگ ایسا پریشان کرتے ہیں کہ ناک میں دم آجاتا ہے۔۔۔ خیر آپ کو کیجئے! ایک اپنا واقعہ عرض کرتا ہوں سنئے خدا تمہارا بھلا کرے۔ سنہ تو کا ذکر ہو گا یاد نہیں کا یا گیارہ ہی تو ہے نہیں۔ بہرحال کچھ ہی تھا۔ وہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ نہ نہ یاد آگیا ہیں سنہ ہی کی بات ہے۔ انہی دنوں بادشاہ ایڈورڈ ہفتم کا انتقال ہوا تھا۔ ہم سہارن پور سے مراد آباد جا رہے تھے۔ گھر کے لوگ بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ بچوں میں نبی یہ للو تھا گود میں یا شاید دودو بھی۔ نہ دودو نہیں ہوا تھا پیدا۔ بہرحال تو بات یہ تھی کہ ہماری خوش دامن کچھ۔۔۔۔ غرضیکہ بعض عوارض تھے۔ انہیں۔ خطوط کے ذریعہ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ وہ علاج کروانے کے لئے شاہ جہاں پور جانے والی ہیں۔ ہم نے انہیں خط میں لکھ دیا تھا کہ ہم مراد آباد کا ٹکٹ لے کر روانہ ہوں گے۔ اگر اس عرصہ میں آپ شاہ جہانپور چلی جائیں تو ایسا انتظام کرنی چاہیئے گا کہ ہمیں اسٹیشن پر اس کی اطلاع مل جائے اور اگر آپ رخصت ہو چکی ہوں تو ہم بجائے مراد آباد اترنے کے اسی گاڑی میں شاہ جہاں پور روانہ ہو جائیں۔ لیجئے جناب ہمارے پہنچتے پہنچتے وہ شاہ جہاں پور روانہ ہو گئیں۔ اسٹیشن پر ہمیں اس کی اطلاع ملی۔ رات کا وقت تھا۔ سردی کا موسم۔ ہم نے سوچا کہ اب کون اتر کر آگے کا ٹکٹ لے۔ شاہ جہاں پور پہنچ کر مراد آباد سے وہاں تک کا کرایہ

جی تو پنڈت جی اور کیا رہ گیا؟ ..... تو نہ رکھ کر لیتے۔ حالانکہ کہہ بھی دیا تھا میں نے اور خود بھی دیکھ رہے تھے کہ چار آدمی بیٹھے ہیں۔ محفل تھی ہوئی ہے باتیں ہو رہی ہیں۔ بڑے نالائق ہو۔ خیر آپ بات کیجئے پنڈت جی ..... وہ چلم بجھ گئی۔ تو تم ہی کو پھر بھر کر لانی پڑے گی ..... کیا پنڈت جی؟"

پنڈت جی کھیلنے سے رہ گئے تھے۔ مگر ہم لوگوں کی لحاظ۔ ایک بار پھر حوصلہ کر کے پہلے کی طرح ہماری ان شرارتوں کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ پائیدان ... پائیدان جلتا ہوا ہماری گاڑی میں آن پہنچا۔ ہم نشانہ تاک رہے تھے کہ یک بیک آگ ہمیں پکڑ لیا۔"

چچا نے ذرا گردن اٹھا کر اور آنکھیں جھپکا کر اپنے متاثر ہونے کا ثبوت دیا۔ "ہاں ہے"

گاڑی نے ہم کو ذرا ذرا ڈولنا شروع کیا کہ تم پیدل مسافروں کو تکلیف پہنچا رہے ہو۔ میں نے مجبوراً یہ بہانا بنایا کہ گھوڑا آم سڑ گئے تھے۔ اس لئے ہم انہیں پھینک رہے ہیں۔ ہم نے خیال نہ کیا تھا کہ کوئی مسافر بھی سڑک پر جا رہا ہے۔

چچا نے یک لخت ایسی بلند آواز میں ایک واہ داد دی جیسے کسی بوتل کا ڈاٹ اچانک کھل گیا ہو۔ "بھائی اللہ کیا بات پیدا کی آپ نے!"

کچھ دیر کو جیسے پنڈت جی کی زبان بند ہو گئی۔ حیرت کے عالم میں ہمارا منہ تکنے لگے۔ ہم سب کی یہ کیفیت کہ شرم سے پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور غصہ کی بڑھتی ہوئی آنکھوں سے گھورتا ہوا اُن سے کہا۔ "جس طرح ہو اس داستان کو ختم کیجئے۔ چچا کی جرأت ہو گئی ہے

چھوٹی موٹی چیزیں ساتھ لے جانی کہاں یاد رہتی ہیں۔ پر چوسنے میں مزہ نہیں رہتا۔ قلمی آم کا۔"

پنڈت جی نے ایک واضح وقفے میں انتظار کیا کہ شاید چچا کچھ اور بھی فرمائیں۔ وہ خاموش رہے۔ تو بات آگے شروع کر دی۔ دس بارہ ہی آم کھا کر پیٹ بھر گیا۔ دو چار اور زبردستی کھائے۔ جب دیکھا کہ بس اور حلق سے نیچے نہیں اترتے۔ اور رسید کی ڈکار آ رہی ہے۔ تو ہاتھ منہ دھو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیٹ پہ ہاتھ پھیرا۔ اور اللہ کا شکر ادا کیا۔"

چچا چھکن نے پھر ایک حاشیہ چڑھایا کہ "کاش ایسی مزیدار نعمت عطا فرمائی۔"

پنڈت جی اب ان حاشیہ آرائیوں سے خائف ہو گئے تھے کہ چچا کی بات ختم ہو جانے کے بعد بھی ان کی زبان نہ کھلتی تھی۔ کچھ تو الجھن کی وجہ سے حواس غائب ہو جاتے۔ کچھ یہ اندیشہ ہوتا کہ بات ابھی اور باقی نہ ہو۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے ذرا تیزی سے داستان بیان کرنی شروع کی۔

"پیٹ بھرے پہ سوجھی شرارت۔ ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ پیدل مسافروں کی سڑک تھی۔ اس پہ مسافر آ جا رہے تھے۔ ان پہ آموں کی دھڑی باڑ ماری شروع کر دی۔ جس کے نشانہ ٹھیک بیٹھتا وہ تو سر پکڑ کر سوچتا رہ جاتا کہ یہ آسمانی گولہ کہاں سے آیا۔ جو مار خالی جاتا اس کی بدولت مسافروں کو مفت کا آم کھانے کو ہاتھ آتا۔"

"بھئی واہ دا۔ لے آئے حقہ؟ بس رکھ دو یہیں پہ..... تو غرض کہ پنڈت جی ایک کھسیل ہاتھ آ گیا آپ کے..... تازہ کر دیا تھا نہ حقہ!"

جاتے ہوئے ہی تو فیض آباد؟ اچھا فیض آباد! ٹھیک! ٹھیک ہے ہاں ٹھیک ہے۔ تم فیض آباد کے سفر میں ساتھ تھے۔ پھر اس کا اس موقع پہ کیا ذکر۔ تو وہ صاحب نہ معلوم کیا نام تھا۔ اس جنکشن کا۔ خیر وہ کچھ ہی تھا۔ نام معلوم ہونا بھی ایسا کیا ضروری ہے۔ تو وہاں سے ایک لالہ ہمارے درجے میں سوار ہوئے۔ وہ بھی یونہی اپنا ایک کوری سنٹنڈیا جس میں پیڑے تھے۔ درجے میں چھوڑ گئے تھے۔ وہ بعد میں ہمارے ہاتھ لگے تو اس قسم کے دلچسپ واقعات اکثر ریل کے سفر میں درپیش آتے رہتے ہیں۔" چچا نے بات ختم کر کے حاضرین پر توجہ کی۔ محفل پر خاموشی طاری ہو گئی۔ پنڈت بیچارے کی حالت عجیب تھی۔ نہ صدر نہ کر سکتا تھا کہ بات ختم کیے۔ یا چپ ہو رہے۔ آخر میں نے ان کی پریشانی رفع کرنے کے لیے کہا۔" تو پنڈت جی بات ختم کیجیے۔"

چچا چونک کر بولے۔" اچھا ابھی باقی ہے بات۔ لیجیے ہم تو سمجھے تھے ختم ہو گئی تو بھلا آپ نے ادھر بیچ میں کیوں چھوڑ دی۔ فرمایئے نا۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

پنڈت نے بے بسی کے انداز میں ہم سب کو دیکھا اور پھر شروع ہو گیا۔" اتفاق سے ہم دوسری گاڑی کے اسی درجے میں سوار ہوئے اس میں اور کوئی مسافر نہ تھا۔ بے فکری سے آم کھانے شروع کر دیئے۔ تراش کر کھانے سے ہوں گے۔؟"

پنڈت جی نے کہا۔" جی نہیں چوسے ہی تھے۔ غالباً چاقو جیب میں موجود نہ تھا۔"

چچا نے زیادہ تعرض نہ کیا۔" خیر خیر کیا مضائقہ ہے۔ سفر میں

اور یہ جو سہارن پور کا قلمی آم ہوتا ہے۔ یہ بے اصل ہے لنگڑے کا آم۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ خیر تو جملہ معترضہ تھا۔ آپ اپنا قصہ جاری رکھئے۔

پنڈت جی بے چاروں پر اب تک کچھ اوس سی پڑ گئی تھی۔ مگر تقاضا سن کر پھر شروع ہو گئے۔

"اگرچہ کہ وہ ہنگامہ مال تھا۔ اور ہمیں کسی طرح اس کا کھانا مناسب نہ تھا مگر نفس کا تقاضا۔ تنہائی کا موقع اور نہایت پکے آم۔ رہا نہ گیا۔ ہم نے سوچا۔ اب کون انہیں ریل والوں کے سپرد کرتا پھرے۔ اور ریل والے بھی ایسے کہاں کے ایماندار ہیں۔ کہ مالک کو واپس کریں گے۔ چنانچہ وہ آم بھی ہم نے اپنے اسباب میں شامل کر لئے۔

اس پر چچا نے ایک ولداری کا قہقہہ لگایا اور بولے "غرضکہ خوب آم ملے کھانے کو نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔

پنڈت بے چارہ حیران کہ یہ اوندھے بیچ میں داد کیسی۔ دو تین دفعہ کہنے کی کوشش بھی کی کہ صاحب باقی بات تو سن لیجئے۔ مگر چچا نے تو بیساختہ انداز میں سر ہلا ہلا کر انہیں بولنے کی مہلت ہی نہ دی۔ کہنے لگے "سمجھ گیا، سمجھ گیا خوب آم ملے پھر نہایت خوب۔ ہمیں بھی ایک مرتبہ اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مراد آباد سے الہ آباد جا رہے تھے۔ ہم راستے میں پڑا وہ جنکشن وہ ہے نہ کیا نام ہے اس کا؟ وہ ارے توبہ۔ دیکھو اچھا سا نام ہے۔ زبان پہ پھر رہا ہے۔ یاد نہیں آتا۔ ماں وہ ہے نہیں جنکشن جہاں سے چھوٹی لائن کسی طرف کو جاتی ہے۔ تمہیں تو یاد ہوگا۔ تمہیں تو۔ تم ہی تو تھے ہمارے ساتھ۔ تمہیں کیسے ہو واہ ہم خود تمہیں لے گئے تھے ساتھ۔ یاد نہیں۔ وہ تمہارا آدھا ٹکٹ لینے پر ہم سے خفا ہو گیا تھا۔ اور نہیں تو کیا۔ ارے بھئی الہ آباد

اسباب اتاریں۔ اپٹرا اترنے والے مسافر اسٹیشن سے باہر چلے گئے۔ جب ہم سارا اسباب اتار چکے تو کیا دیکھتے ہیں کہ دروازے میں اوپر کے تختے پر ایک گٹھڑی رکھی ہوئی تھی۔ "جو ہماری نہ تھی"۔ دودو پان لے کر آگیا۔ چچا پان کھانے میں مصروف ہو گئے۔ پنڈت جی اُن کی توجہ دوسری طرف دیکھ کر رک گئے، تو تقاضا ہوا۔ آپ کہے جایئے۔ میں سن رہا ہوں۔ پان کھول کر کتھا چونا دیکھا کتھا زیادہ تھا۔ زیر لب کچھ اس پر تنقید ہوئی۔ "اب تک پان لگانے کا سلیقہ نہیں آیا۔ اچھا خاصا پلستر ہے۔ کتھے کا۔ لاحول ولا" کتھا پونچھا۔ پان کھایا۔ چھالیہ تمباکو ہتھیلی پر رکھ کر پھنکی لگائی۔ پان کلّے میں دبایا۔ پنڈت جی کی دلداری کو مسکرا کر فرمایا۔ "آپ تو خاموش ہو گئے پنڈت جی"۔

پنڈت جی بے صبری سے اس عمل کے تمام ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ چچا کو متوجہ دیکھ کر پھر شروع ہو گئے۔

ساری ٹرین خالی ہو گئی تھی۔ چنانچہ یقین تھا کہ اب مالک نہ آئے گا۔ دل میں شوق پیدا ہوا کہ گٹھڑی کھول کر دیکھئے تو اس میں کیا ہے میں نے اُسے اٹھا کر کھولا، تو کیا دیکھتا ہوں کہ سہانپور کے نہایت اعلیٰ درجے کے مالدہ آم قریب ایک سو کے رکھے ہیں"۔

چچا منہ اونچا کر کے پیک سنبھالتے ہوئے بولے۔ "ارے بھئی ذرا الالدان بلھانا"۔ پیک تھوکی۔ باچھیں پونچھیں۔ بولے۔

یہ سہانپور کے کیسے آم کہے آپ نے؟ مالدہ آم اور سہسان پور کے؟ بھلا سہارن پور میں مالدہ آم کہاں سے آیا؟ اماں یہ تم پنجاب کے اضلاع کے لوگ آموں کی قسموں کے صحیح نام بھی نہیں جانتے؟ مالدہ آم ہوتا ہے۔ بڑا سا پھیکا پھیکا۔ ریشہ دار۔ جسے تم لوگ بمبئی کا آم کہتے ہیں

پنڈت جی نے کہا "جی ہاں یہ راستہ تو میل ٹرین ہی کا ہے مگر دور کا ہے۔ میں قریب ترین راستے سے روانہ ہوا تھا۔"

چچا نے فرمایا "یوں آپ کو ہر راستے سے روانہ ہونے کا اختیار تھا لیکن یہ خیال آپ کا صحیح نہیں کہ ہمارا بتایا ہوا راستہ دور کا ہے۔ اور یقین نہ ہو تو ٹائم ٹیبل شاید موجود نہ ہو مگر کیا ہوگا۔ ورنہ ابھی طے ہو جاتی بات پر۔ خیر۔ اگر بالفرض وہ راستہ دور کا بھی تھا جب بھی یہ غلطی تھی آپ کی کہ سواریوں کو ساتھ لے کر ایسے راستے سے گئے۔ جدھر سے گاڑی بدلنی پڑتی تھی۔"

پنڈت جی ادبی زبان سے بولے۔ "اس راستے سے بھی سہانپور پر گاڑی بدلنے کی ضرورت ہوتی۔"

چچا کتوب کے بند باندھنے لگے۔ "بدلنے کی ضرورت ہوتی؟ یقین ہے؟ اچھا! پھر تو کچھ ایسی غلطی نہیں کی آپ نے۔ خیر وہ کسی راستے بھی گئے آپ۔ اب اس بعد از وقت بحث سے کیا حاصل آپ بات کہیے۔"

پنڈت جی نے کہا "تو صاحب اسباب تھا ہمارے ساتھ زیادہ۔"

چچا نے حاشیہ آرائی کی "سو تو ہونا ہی تھا۔ آخر شادی بیاہ میں جا رہے تھے۔ اور پھر ساتھ سوالیاں، کچھ نہ پوچھیے۔ ایسے موقعوں پر یہ عورتیں کیا کچھ سامان ساتھ لے کر نکلتی ہیں۔ ٹرنک اور بکس اور گٹھڑیاں اور ٹوکریاں اور بستر اور جانے کیا کیا۔ آفرہ میرا تو سوچتے سے دم الجھتا ہے۔"

پنڈت جی بولے "جی ہاں تو ہا پڑیں ہم اپنے اپنے درجے سے

پنڈت جی بولے "پچھلی گرمیوں مراد آباد میں ایک عزیز کی شادی تھی۔ سواریوں کو وہاں پہنچانے کے لئے میرٹھ سے میں اور میرا چھوٹا بھائی روانہ ہوئے۔ ہاپڑ جنکشن پر گاڑی بدلتی تھی۔ وہاں جو اترے۔

"کہاں"

"میرٹھ سے مراد آباد جاتے ہوئے گاڑی ہاپڑ جنکشن پر بدلنی پڑتی ہے"۔

"میرٹھ اور مراد آباد کے راستے میں ہاپڑ کہاں سے آگیا؟"

"صاحب مجھے تو یہی راستہ معلوم ہے"۔

"اور جو وہ سیدھا راستہ ہے؟"

"کم از کم نزدیک کا راستہ تو یہی ہے"۔

"ارے بھئی۔ اب دور نزدیک پر آگئے۔ یوں ہی ہماری آدھی عمر بھی ریلوں ہی کا سفر کرتے گزری ہے۔ میں آپ کو میل ٹرین کا راستہ بتاتا ہوں۔ پھر تو دور نزدیک کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا؟ سنئے میرٹھ سے سہارنپور، سمجھ گئے؟ اور جناب سہارنپور سے لکسر، لکسر سے نجیب آباد....."

"کلکتہ میل کا راستہ؟"

"اب بیچ میں نہ ٹوکئے، پورا راستہ سن لیجئے۔ مجھ سے نجیب آباد سے نگینہ، نگینہ سے دھام پور اور جناب دھام پور سے مراد آباد آیا سمجھ میں۔ یہی گاڑی آگے شاہجہاں پور، لکھنؤ، بنارس کلکتہ نکل جاتی ہے مگر اس موقع پر اس کے تذکرے سے کیا حاصل، ہمیں تو ہے مراد آباد کے راستے سے سروکار ہے"۔

حقہ کے بغیر۔ ارے بھئی للو۔ ذرا تم جا کر حقہ نہیں بھر لاتے؟ شاباش شاباش جیتے رہو۔ مگر دیکھنا ذرا تازہ کر لینا حقہ سمجھ گئے نہ اور سنو تو ارکھ کر لانا اور بات تو سنو۔ بڑا غیب ہے۔ تم لوگوں میں کہ آدھی بات سن کر چل پڑتے ہو، طاق میں سے خمیرہ لے لینا۔ آج ہی آیا ہے۔ لکھنؤ سے پندرہ روپے سیر کے حساب سے کچھ سادہ تمباکو اس میں ملا لینا بڑا مہنگا ہو گیا ہے۔ خمیرہ صاحب خود اپنے زمانے کی بات کہتا ہوں۔ کہ پانچ روپے سیر کے حساب سے خریدا ہے میں نے۔ ایک دکان تھی۔ لکھنؤ جیسے جیسے کی، صاحب واللہ کیا بناتا تھا۔ خمیرہ۔ کش لگاتے ہی ارواح خوش ہو جاتی تھی۔ جب لکھنؤ جاتا اس کے ہاں سے اکھٹا خرید لاتا تھا۔ اور اب تو وہ بات ہی نہیں ہی تمباکو میں۔ کہنے کو خمیرہ کہئے یا جو جی چاہے نرا گوبر ہوتا ہے۔ خیر، تو ہاں وہ قصہ کیا تھا پنڈت جی۔

پنڈت جی اتنا ہی کہنا پائے تھے "اجی قصہ کیا ہوتا یوں ہی ایک بات سنا رہا تھا۔ پھر عرض کئے دیتا ہوں کہ اتنے میں چچا کی نظر چھٹن پر پڑ گئی۔ ارے یہ چھٹن بھی ہے یہاں! کیا دبک کر بیٹھا ہے کہ نظر تک نہ آیا مجھے۔ ارے سویا نہیں تو اب تک صبح اٹھے گا، کیسے؟ ملا جی باہر کھڑے چیخا کریں گے۔ اور پڑا چارپائی پر کروٹیں لیا کرے گا۔ چل اندر۔ ہیں اوں اوں؟ اوں اوں کیا معنی؟ اب اوں اوں کرو۔ یا روں روں، جا کر سونا ہوگا۔ نہ صاحب عادت بگڑتی ہے۔ بچے کی چلو جا کر سوؤ..... جی تو پھر؟ میں نے کہا خاصدان میں پان کا ٹکڑا بھی ہے کوئی؟ ذرا تم جا کر نہیں آتے دو دو؟ ساتھ ہی مراد آبادی تمباکو بھی رکھ لاتے۔ جی تو پنڈت جی پھر۔ غرضکہ سفر کیا تھا۔ آپ نے خوب؟"

یہ ریل کا قصہ تو چچا میاں کو بھی سنا دیجیے۔"

چچا چھکن عام طور پر تو جلدی سو رہنے کے عادی ہیں لیکن اس وقت تو جیسے اشارے کے منتظر کھڑے تھے۔ پنڈت جی ہاں یا نہیں بھی نہ کرنے پائے تھے کہ کواڑ کھول یہ کہتے ہوئے اندر تشریف لے آئے "ہاں پنڈت جی ہم بھی تو سنیں۔ وہ ریل کا کیا قصہ ہے"؟

یہ کہہ کر چچا انگیٹھی کے قریب پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔ رضائی کو از سر نو تکلف سے اوڑھا۔ کندھوں پر ڈالا۔ زانوؤں کے نیچے دبایا کہنوپ پر ہاتھ پھیر کر اسے سر پر ٹھیک جمایا۔ ذرا دیر اس کے بند سے شغل کیا باندھنا چاہا نہ باندھا۔ پھر ذرا ہاتھ سینکے۔ پہلو کو جھک کر خاصدان کا جائزہ لیا بولے۔ ہاں پنڈت جی تو کیا قصہ ہے وہ؟"

پنڈت جی ابھی زبان بھی کھولنے نہ پائے تھے کہ ارشاد ہوا کہ حقہ نہیں پیتے پنڈت جی! انہوں نے بمشکل "جی نہیں" کہا ہوگا کہ بولے۔ "بھلا حقہ کے بغیر بات چیت کا کیا مزہ؟"

زنانہ خانے کی طرف منہ کر کے بندو اور امامی کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ ارے یہاں آؤ! سنتے ہو! یہاں آؤ کوئی! ابے نہیں سنا کان چورے گئے۔؟ او بندوا او امامی! کہاں مر گئے کم بختو! دیکھا، بس سو گئے، دونوں کے دونوں۔ ان بدمعاشوں کو ایسی سر شام سونے کی عادت پڑی ہے کہ فکر ہی نہیں رہی کسی بات کی۔ ابے آتے ہو یا میں آؤں؟ لاحول ولا۔ بھئی بڑے حرام خور ہیں یہ لونڈے۔ قصور سارا تمہاری چچی کا ہے۔ شام سے روٹی دے دلا کر کم بختوں کو نچنت کر دیتی ہیں۔ خیر جی۔ تو پنڈت جی کیا تھا وہ قصہ؟ مگر کچھ مزہ نہیں بات چیت کا

گٹھڑی رکھی دیکھی اور اُسے لاوارث سمجھ کر اپنے اسباب میں شامل کر لیا۔ اس کے کچھ آم تو مزے لے لے کر کھائے۔ کچھ آموں سے پیدل سڑک کے مسافروں کا نشانہ بناتے رہے۔ پھر بعض وجوہ سے ڈر کر کہ کہیں چوری کھل نہ جائے۔ باقی آم اور نئی دوہر جس میں یہ لپٹے ہوئے تھے چلتی گاڑی میں سے باہر پھینک دی یوں اپنی چوری کے تمام سُراغ مٹا کر بڑی تسلی سے سفر کرتے رہے۔ لیکن مزہ منزل مقصود پر اپنے گھر پہنچ کر آیا جب پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں۔ کہ گھر کی ماما کسی چیز کو تلاش کرتی ہوئی باہر نکلی اور بولی میاں میں نے ریل میں سوار ہوتے وقت اپنی نئی دوہر جس میں سو قلمی آم بندھے تھے۔ آپ کے درجے میں رکھ دی تھی وہ اسباب میں نظر نہیں آتے۔

پنڈت جی نے یہ واقعہ ایسے مزے سے بیان کیا اور آخر میں ایسی مضحکہ انگیز صورت بنا کر اپنی حماقت کا اعتراف کیا کہ ہنسی کے مارے سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہماری ہنسی کی آواز کہیں چچا چھکن کے کان میں بھی پہنچ گئی۔ دروازہ کھول کر پوچھنے لگے۔

"ارے بھئی کیا واقعہ ہوا۔ جو یہ قہقہے اُڑ رہے ہیں؟"

ہم سب کھڑے ہو گئے۔ پنڈت جی آداب بجا لائے۔ محبوب سے نظر آئے تو چچا نے ان ہی سے پوچھا "ارے بھئی پنڈت، یہ کیا پھلجھڑیاں چھوڑ رہے ہو۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ؟"

پنڈت جی نے شرما کر جواب دیا۔ "کچھ نہیں صاحب یوں ہی اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔"

بیٹھے بٹھائے یہ ہی جو شامت آئے۔ کہیں کہہ بیٹھا۔ پنڈت جی۔

سیّد اِمتیاز علی تاج

چچا چھکّن نے ایک بات سُنی!

جانتا بھی تھا کہ چچا چھکن میں مسلسل دو منٹ کسی کی بات سُننے کی
ب نہیں۔ مین میخ نکالنا ان کی عادت ہے، بات کاٹے بغیر اُن سے رہا نہیں۔
تا۔ لفظ لفظ پر ٹوکتے ہیں مگر ہونی شدنی ہو گئی حماقت، رات کو اپنے
دوست پنڈت درگا پرشاد کو کھانے پر بُلا رکھا تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے
بعد انگیٹھی بیچ میں رکھے، گاؤ تکیوں سے ٹیکا لگائے مزے سے چاندنی پر
دراز تھے۔ سامنے چلغوزوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کھا بھی رہے تھے۔
ں بھی کرتے جا رہے تھے۔ سُرور سا جما ہُوا تھا۔ اطمینان اور بے فکری
ے بیٹھے ہوں اور پنڈت جی کا دل بولنے چاہ رہا ہو۔ تو یوں سمجھئے پھول
ڑتے ہیں منہ سے جی چاہتا ہے صحبت جمی رہے اور یوں ہی بیٹھے اُن کی
ں سُنا کر۔ جو بات ہو ایسے سلیقے اور شگفتگی سے کہتے ہیں اور اپنے انداز
ف سے اس میں ایسی جان پیدا کر دیتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے۔

پنڈت جی ہمیں اپنے ایک سفر کا واقعہ سنا رہے تھے کہ انہوں نے
طرح ایک اسٹیشن پر گاڑی بدلتے وقت درجے میں آموں کی ایک

سید امتیاز علی تاج

اردو کے مشہور و معروف ڈراما نگار ادیب سید امتیاز علی تاج ۱۹۰۰ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد منشی ممتاز علی مشہور اشاعتی ادارہ دارالاشاعت پنجاب کے بانی اور مالک تھے۔ اور آپ کی والدہ تہذیبِ نسواں نامی مقبولِ عام رسالہ شائع کرتی تھیں۔ تاج کی پرورش ادیب والدین کے زیرِ سایہ ادبی ماحول میں ہوئی۔ ہفتہ وار پھول آپ ہی کیلئے جاری ہوا تھا۔ آپ نے فارسی میں بی اے آنرز کیا۔ آغا حشر اور پطرس نے آپ کے فطری ڈرامائی ذوق کی سرپرستی کی۔ اور آپ نے اپنا شہرۂ آفاق ڈراما "انارکلی" تصنیف کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چیزیں لکھیں جن میں سے "چچا چھکن" اپنے مزاحیہ رنگ کی بدولت ممتاز ہے تقسیم ہند کے بعد لاہور میں اشاعتِ کتب میں مصروف ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز کا اعزاز بخشا ہے۔

"چچا چھکن" مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے ہیرو "چچا چھکن" ہیں۔ اس کا پہلا مضمون انگریز مصنف جیروم کے ایک مضمون کا چربہ ہے وہ بہت مقبول ہوا تو آپ نے اسی انداز کے اور افسانے لکھے اور یوں یہ مجموعہ تیار ہو گیا۔ "چچا چھکن" نے ایک بات سنی" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جو انسانی فطرت کے ایک خاص پہلو کا مطالعہ ہے۔

یہاں سے چل کر ٹریم کرافورڈ مارکٹ پر رکی۔ ترکی ٹوپی والے صاحب پہلے اُتر گئے۔ اور ان کے دونوں یار بھی نیچے اترنے کی جلدی کی میں ان دونوں کو چیر کر نیچے اُتر گیا۔ جو صاحب پہلے نیچے اُترے تھے۔ ان کو دیکھ کر میں مسکرایا کہ جناب ہر شخص کی جیب سے بٹوہ نکالنا آسان کام نہیں مگر بجائے شرمندہ ہونے کے وہ بھی مسکرائے اور ایک طرف چلدیئے۔ اب جو جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں تو غائب۔ اس وقت ان لوگوں کی ترکیب سمجھ میں آئی کہ ایک صاحب نے نیچے اُتر کر مجھے مطمئن کر دیا۔ دونوں نے اس طرح راستہ روکا کہ مجھے دونوں ہاتھوں سے ان کو ہٹانا پڑے۔ ان میں سے ایک نے اس کشمکش میں بٹوہ غائب کر دیا۔ غنیمت یہ ہوا کہ جتنے روپے میں لے گیا تھا وہ عینک والے کو دے آیا تھا۔ شاید پانچ روپے کا ایک نوٹ اور کچھ آنے رہ گئے تھے ہاں ڈاکٹر ڈگن نے عینک کے جو نمبر دیئے تھے وہ بٹوے کے ساتھ گئے۔ واقعی کسی نے سچ کہا کہ مَنْ ضَحِکَ ضُحِکَ (جو دوسروں پر ہنستا ہے اس پر دوسرے ہنستے ہیں) بہرحال میں ہوٹل سے جا کر اور روپے لایا اور دوسرا بٹوہ خریدا۔ ونشا کے ہاں جا کر نمبروں کی نقل لی لیکن اس کارروائی نے کچھ ایسا کھسیانا کر دیا کہ پھر اپنے صاحب بہادر کو بھی بھول گیا۔ سات بجے کمرے میں کھانا منگا کھا لیا۔ اور ساڑھے آٹھ بجے کے میل سے روانہ ہو گیا بلا سے اوپلے گئے تو گئے ایک مزے دار مضمون تو مل گیا ہاں یہ کہے دیتا ہوں کہ پڑھنے والے حضرات براہ کرم حتی المقدور اس کو فرضی قصہ سمجھنے کی کوشش کریں تو زیادہ مناسب ہے۔

بعد انہوں نے کہا کہ "میں پہلے اور اب کے نمبروں میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ آپ شوق سے ان ہی نمبروں کی عینک خرید لیجئے۔ بہت دنوں کام دے گی۔ مگر جب اُتر جائے تو مجھ سے آکر ضرور ملئے۔ کہیں اترے ہوئے نمبروں کی عینک نہ لگا لیجئے پھر یئے۔ آنکھیں ستیاناس ہو جائیں گی۔ وہاں سے نمبر لے میں دنشا۔ ایم دستور کی دوکان پر پہنچا۔ نمبر دیئے اور عینک لے آیا۔ ایسی ٹھیک بیٹھی کہ دل خوش ہو گیا۔ اب ٹھہر جانے کی سوجھی اور شام ہی کو روانہ ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔

میں نے جب دوسروں کی ہنسی اڑائی ہے تو اپنی بے وقوفی کو کیوں چھپاؤں۔ ایک مسلمان بھائی نے مجھے بھی بے وقوف بنایا اور خوب بنایا دنشا دوکان سے میں ٹریم میں سوار ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ ایک بھلے آدمی ٹریم میں داخل ہوئے۔ ان کی شکل اب تک میرے آنکھوں کے سامنے ہے چھریرا بدن۔ سفید رنگ۔ میانہ قد۔ بھورے بال۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ جسم پر خاکی کوٹ۔ پتلون۔ کوٹ کے اوپر بغیر ہاتھوں کے کیپ دار برساتی جب ٹریم میں وہ میرے پاس سے گزرنے لگے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری شیروانی کی جیب میں سے روپیوں کا بٹوہ خود بخود اوپر کو اٹھا چلا آرہا ہے میں نے ایک دفعہ ہی جیب پر ہاتھ ڈالا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بٹوہ جیب سے باہر آگیا۔ خیر بٹوے کو اندر کیا اور ان صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا کہ آپ تیز ضرور ہیں۔ مگر میں آپ سے بھی کچھ زیادہ تیز ہوں۔ انہوں نے شرما کر گردن نیچے کر لی۔ تھوڑی دیر میں ٹریم ٹھہری۔ دو آدمی اندر آئے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان صاحب سے کچھ باتیں ہو گئیں۔ اس وقت تو میں نہیں سمجھا تھا۔ مگر ہاں بعد میں سمجھ میں آیا کہ یہ دونوں ان حضرات کے ساتھی تھے۔ خیر

یہی وجہ ہے کہ روز آنہ جس رنگ برنگ کے مریض ہمارے دیکھنے میں آتے ہیں ویسے ولایت کے ڈاکٹروں کو برسوں میں بھی نہیں ملتے اور جتنے آپریشن ہم ایک ہفتہ میں کر لیتے ہیں وہاں کے ماہرین فن کو سال بھر میں بھی نہیں کرنے پڑتے۔ اس لئے یہ خیال تو بیکار ہے کہ ولایت جا کر تم یہاں سے کچھ زیادہ فائدہ حاصل کر سکو گے۔ ہاں اپنے اطمینان کے لئے جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب اندھا کیا چاہے دو آنکھیں جب یہیں مجھ کو آرام ہو جاتا ہے تو پھر میں کوئی دیوانہ ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ روپیہ خرچ کر کے جرمنی یا فرانس جاؤں۔ اچھا اب آپ عینک کے نمبر نکالئے اس میرے شیر نے دس منٹ میں نمبر نکال کر میرے حوالے کئے۔ اس کے بعد کچھ سوچ کر کہا" خیر بیٹھیے میں دوا ڈال کر بھی نمبر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر تھوڑی بہت کچھ غلطی ہوئی ہے تو وہ بھی نکل جائے گی۔ یہ کہہ کر انھوں نے میری آنکھوں میں دوا ڈالی اور دوسرے روز سہ پہر کو پھر آنے کی ہدایت کی۔ یہاں سے نکل کر میں پھرتا پھراتا شام کو ہوٹل پہنچا۔ دوا پڑنے سے آنکھ میں پردہ سا آگیا تھا۔ اس لئے رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے ہی میں کھایا۔ صاحب بہادر نے بھی میری تقلید کی۔ دوسرے دن بھی میں کھانے کے کمرے میں نہیں گیا۔ مگر چونکہ ہمارے صاحب بہادر ان دو وقت کے کھانوں سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے ناشتہ اور لنچ کھانے کے کمرے ہی میں جا کر کھایا۔ منیجر صاحب نے میری خیریت پوچھنے آئے۔ ان سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ صاحب نے کل کا سبق پوری طرح دہرایا۔ ہاں اس روز تو اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ سہ پہر تک میری آنکھیں صاف ہو گئیں۔ میں نے جا کر ڈاکٹر ڈگن کو دکھائیں۔ معائنے کے

مناسب نہ سمجھی۔ بیسکٹ پلیٹ میز پہ ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اپنے کمرے میں آ گئے۔ اور حمام میں جا کھلیاں کرنی شروع کیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے ہزاروں ہی کلیاں کر ڈالیں۔ جب کہیں جا کر کچھ طمانیت ہوئی۔ مجھے افسوس بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ افسوس تو اس لئے ہوا کہ بیٹھے بٹھائے ایک غریب کا منہ پھلنی کر دیا۔ اور ہنسی اس بات پہ آئی کہ اس بیوقوف کو صاحب بننے کی کیا ضرورت تھی۔ خیر انہیں بھی خاصے مزے سے گزر گیا۔

سہ پہر کو میں ڈاکٹر ڈگن سے ملا۔ تمام کیفیت بیان کی۔ اپنے ہاں جانے کا ذکر کیا۔ وہاں والوں کی رائے ظاہر کی کہ کس طرح کئی گھنٹے آنکھوں کا امتحان کرنے کے بعد مجھے صاف جواب دے دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے دو باتیں ایسی کہیں کہ میرے دل کو لگ گئیں۔ کہنے لگے "میں کسی کی برائی نہیں کرتا۔ ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ آنکھوں کا زیادہ دیر تک امتحان کرنا کچھ مفید نہیں ہوتا۔ مریض کی آنکھیں گھورتے گھورتے پتھرا جاتی ہیں۔ اور اس کے متعلق میری یہ رائے ہے کہ آنکھوں کا تم کو کوئی مرض نہیں ہے۔ صرف صحیح نمبر کی عینک کی ضرورت ہے۔ ولایت جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مگر یہ سمجھ لو کہ جو کچھ میں کر سکتا ہوں اس سے زیادہ وہاں بھی تم کو توقع نہ کرنی چاہیئے یورپ والوں کی یہ کیفیت ہے کہ بچپن ہی سے آنکھوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ذرا کچھ فرق آیا اور آنکھ کے ماہر فن کے یہاں پہنچے۔ علاج کیا عینک لی۔ چلو چھٹی ہوئی۔ ہمارے ہاں لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کہ جب آنکھیں بالکل تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس وقت علاج کا خیال آتا ہے خیال آنے اور اس پہ عمل کرنے میں بھی برسوں گزر جاتے ہیں۔ آخر خدا خدا کر کے ڈاکٹر کے پاس آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آج ہی اچھے ہو جائیں۔

منیجر صاحب اور بیٹلروں کو ہنسی آئی۔ بچاروں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور ایک ایک کر کے سب سرک گئے۔ اس کے بعد میں جو چیز کھائی ذرا سلیقے سے کھائی اور صاحب نے ہو بہو نقل اتاری یہ میں نے اس لیے کیا کہ کہیں کھٹک نہ جائیں اور مزا کرکرا ہو جائے۔

اس کے بعد میں جے جے اسپتال میں ڈاکٹر ڈگن سے ملنے کا وقت دریافت کرنے چلا گیا۔ پھر پھرا کر کوئی ایک بجے واپس آیا۔ دیکھا کہ صاحب بہادر اپنے کمرہ میں براج رہے ہیں۔ شاید ان کو میرے آنے کا انتظار تھا کیونکہ ادھر میں کھانے کے کمرے میں آیا ادھر وہ بھی آ پہنچے لنچ شروع ہوا۔ پہلے تو صحیح صحیح کارروائی ہوتی رہی۔ اس کے بعد میں نے توس اٹھایا۔ چھری سے اس پر مکھن ملا۔ رائی کی بوتل میں چھری ڈال تھوڑی سی رائی نکالی اور ذرا پہلو بدل اس طرح ہاتھ چلایا گویا توس پر رائی مل رہا ہوں۔ بھلا نقل را جہ عقل۔ انہوں نے بھی کچھ انتظار کر کے کر کے پوری نقل اتاری۔ ادھر میں نے توس منہ میں رکھا اور ادھر انہوں نے اپنے توس پر منہ مارا۔ خبر نہیں بچارے کے حلق پر کیا گزری ہاں آئینے میں یہ ضرور دیکھا کہ ایک دفعہ ہی ان کے چہرے کی حالت کچھ بدل سی گئی۔ وہ کوشش کر رہے تھے۔ کہ منہ سے نوالہ نکال کر پھینک دیں۔ مگر میں ایک دفعہ ہی ان کی طرف مڑ گیا۔ اب بچارے کو نہ نوالہ اگلتے بنتی ہے نہ نگلتے۔ آخر کسی نہ کسی طرح حلق سے اتار ہی لیا۔ اس کے بعد میں نے ان سے باتیں شروع کیں۔ باتیں کرتا جاتا اور توس کھاتا جاتا۔ انہوں نے بھی ڈرتے ڈرتے توس کا دوسرا ٹکڑا منہ میں رکھا اور چائے کے سہارے نیچے اتارا۔ خدا خدا کر کے توس ختم ہوا۔ میں نے بھی اس سے زیادہ کارروائی

پاس پہنچے اور پہلو میں کھڑے ہو کر پوچھا۔ "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے اگر کسی انتظام کی ضرورت ہو تو کر دیا جائے"۔ صاحب نے فرمایا نہیں سب ٹھیک ہے"۔ یہ باتیں کرتے کرتے منیجر صاحب نے اس کاغذ پر نظر ڈال لی۔ مگر کچھ چپ سی کنتھ میں ہو گئے۔ وہاں سے ٹہلتے ٹہلتے میرے پاس آئے اور وہی سوال مجھ سے کیا۔ میں نے بھی جواب دیا اور آہستہ سے پوچھا۔ "آپ نے کاغذ دیکھا"۔ کہا کہ ہاں دیکھا۔ اس پر لکھا ہے "ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک" سمجھ میں نہیں آتا اس کے کیا معنی ہیں میں نے کہا۔ "آپ نہ سمجھے ہوں۔ میں سمجھ گیا۔ صاحب نے نئے سوٹ بنوائے ہیں اور اپنی کتاب دیکھ کر ہر سوٹ پر اس کے پہننے کا وقت لکھ دیا ہے۔ یہ ساڑھے سات سے ساڑھے دس تک پہننے کا سوٹ ہے گھبراہٹ میں کاغذ نکالے بغیر کوٹ پہن آئے۔ چلو ان کی صاحبیت کا کچھ رنگ معلوم ہو گیا۔ اب دیکھو دوسرا تماشہ دکھاتا ہوں"۔ صاحب بہادر اس وقت اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ میں نے اپنی رکابی اس طرح رکھی کہ وہ دیکھ سکیں کہ میں پوریج کس طرح کھاتا ہوں۔ میں نے نمک کا چمچہ بھرا۔ رکابی تک لایا اور اس طرح الٹا کہ نمک بجائے رکابی کے میرے نیکن پر گرا۔ اس طرح دو تین چمچے بھر بھر کر ڈالے۔ بعد میں سرکے کی بوتل لی۔ اس کے منہ پر انگلی رکھ کر رکابی میں اس طرح الٹی گویا سرکہ ملا لیا۔ صاحب اخبار کی آڑ سے میرے ان حرکات کو دیکھتے رہے۔ اس کے بعد رکابی میں نے ذرا سرکا کر اپنے سامنے کر لی اور جلدی جلدی شکر کے دو تین چمچے ڈال۔ دودھ انڈیل چمچے سے ملا پھر رکابی ذرا ان کی طرف کر کے کھانا شروع کیا وہ پوریج کھانے کی ترکیب سمجھ گئے۔ نہایت اطمینان سے دل کھول کر نمک اور سرکہ ملایا اور چمچے سے کھانا شروع کیا۔

کی عملی تعلیم کا لطف اٹھانے پر تیار ہو گئے۔ ہاتھ منہ دھو کر میں نیچے اترا اور دوسری منزل میں جو کھانے کا کمرہ ہے۔ اس میں داخل ہوا جتنے بٹلر تھے، مجھے پہچانتے تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر ذرا مسکرائے میں سمجھ گیا کہ منیجر صاحب نے ضروری ہدایتیں دے دی ہیں۔ سڑک کے رخ پر میز بچھا ہوئی تھی۔ اس پر میں جا بیٹھا۔ میرے سامنے بڑا آئینہ تھا۔ پیچھے دو میزیں اور تھیں۔ سیدھے ہاتھ پر سڑک تھی۔ اور بائیں طرف اور بہت سی میزیں کرسیاں اور سامان کا کمرہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے صاحب بہادر کو بھی میرے میز پر پہنچ جانے کی اطلاع ہوئی وہ نیا سوٹ پہنے ٹوپی اتارے، سگار پیتے بڑے ٹھاٹھ سے کمرے میں داخل ہوئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور کچھ دل میں سوچ کر میری پشت کی جانب جو میزیں بچھی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک پر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس طرح بیٹھنا چاہتے ہیں کہ یہ مجھ کو دیکھ سکیں کہ میں کس طرح کھانا کھاتا ہوں اور میں اُن کو نہ دیکھ سکوں لیکن شاید ان کو اس کا خیال نہ رہا کہ میرے سامنے یہ بڑا آئینہ لگا ہوا ہے۔ اور اُن کی سب حرکتیں مجھ کو اس میں دکھائی دیتی ہیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزرے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ اُن کے کوٹ کے کالر میں پیچھے کی طرف ایک پرچہ پن سے لگا ہوا ہے۔ بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ کیا معمہ ہے۔ اتنے میں بڑے بٹلر نے پورچ کی رکابی شکر اور دودھ سامنے لا رکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ "منیجر صاحب کو بلاؤ" وہ دروازے ہی تک گیا ہوگا کہ منیجر صاحب خود مسکراتے ہوئے آئے۔ اور میرے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئے میں نے آہستہ سے ان سے کہا "مسٹر ذرا چپکے سے یہ تو دیکھ آؤ کہ ہمارے صاحب کے کالر پر یہ کاغذ کیا لگا ہوا ہے۔" وہ میرے پاس سے اٹھ صاحب بہادر کے

تیسری منزل کے کمرہ نمبر ۳۶ میں جا ٹکا۔ اوپر سے دیکھا تو صاحب بہادر کی لدی پھندی دو موٹریں نیچے دروازے کے سامنے آکر ٹھہریں اسباب اُترنا شروع ہوا۔ تھوڑی دیر میں آگے آگے مینجر صاحب اور پیچھے پیچھے ہمارے دوست آئے کمرہ نمبر (۳۵) کھولا گیا۔ اور اس میں انہوں نے قیام فرمایا مینجر صاحب اُن سے فارغ ہو کر میرے پاس آئے کہنے لگے "یہ کیا بات ہے جو آپ نے کہا تھا۔ بجنسہٖ وہی انہوں نے کہا آتے ہی پوچھا کہ "ابھی جو صاحب آئے ہیں وہ کون سے کمرے میں ٹھہرے ہیں"۔ میں نے کہا "نمبر (۳۶) میں" انھوں نے فرمایا "ہمیں اُن کے برابر والا کمرہ دو۔ اور جب وہ میز پر آئیں تو ہم کو اطلاع کر دیا کرو"۔ میں نے مینجر صاحب سے کہا "ذرا تم نیچے جاؤ۔ میں ابھی آکر سارا قصہ بیان کرتا ہوں۔ اور ہاں میرے کمرے کے سامنے جو ہندوستانی پیخانہ ہے اس کا ٹوٹا اٹھوا دو۔ صاحب کو ٹوٹوں سے بڑی نفرت ہے۔ اسٹیشن پر قلیوں سے لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی"۔ بیچارے مینجر پریشان تھے کہ یہ خاصہ بھلا چنگا آدمی دلوانہ تو نہیں ہو گیا۔ کچھ بڑبڑاتے ہوئے رخصت ہوئے۔ تھوڑی دیر میں میں نے جا کر ان کو سب کچھ سمجھا دیا۔ کہنے لگے "بھئی ذرا دیکھنا ایسی کوئی بات نہ ہو کہ ہوٹل بدنام ہو جائے۔ لطف تو ضرور آئے گا مگر یہ بیوپار کا معاملہ ہے"۔ میں نے کہا "آپ خاطر جمع رہیے۔ بلوں سے کہہ دیجیے گا کہ میں جو مانگوں وہ مجھ کو بلا عذر لا کر دیا کریں۔ اس میں آپ کا کیا نقصان ہے، اور آپ کے ہوٹل کی کیا بدنامی ہے۔ میں شکر کے بجائے اگر کافی میں کافی مرچیں ڈال کر پیتا ہوں تو آپ کو واسطہ؟ آپ کو اپنی رقم سے کام"۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے اتنا کہنے پر کچھ سمجھ گئے اور خود بھی صاحب بہادر کے آداب مجلس

جارہے ہو؟ کب تک رہو گے؟ کب واپس آؤ گے؟ انگریزوں میں رہنے سہنے کا اتفاق ہوا ہے؟ انگریزی آداب مجلس سے واقف ہو؟ تم خود کس ہوٹل میں ٹھہرو گے۔ غرض ہزاروں سوال کر ڈالے، جب ان کو معلوم ہوا کہ باوجود ہندوستانی لباس کے میں انگریزی معاشرت سے بے بہرہ نہیں ہوں اور بمبئی ہوٹل میں ٹھہر رہا ہوں تو ان کے چہرے پہ ذرا بشاشت سی آگئی سمجھے ہونگے کہ چلو کتاب کے مضمون پر عمل کرنے میں کچھ تو اس سے مدد ملیگی۔

دوسرے اسٹیشن پر میں تو اتر کر کھانا کھانے چلا گیا اور ہمارے صاحب بہادر نے اسٹیشن پر سے پوریاں اور مٹھائی خریدی اور خوب تن و تازہ ہو شب خوابی کے کپڑے پہن بستر بچھا روشنی گل کر سو گئے۔ ان کا بھانڈا نہ پھوٹتا اگر حمام میں ترکاری اور مٹھائی کے پتے پڑے ہوئے مجھے نہ ملتے، پتے دیکھ کر میں نے نتیجے نکالے اول یہ کہ انھوں نے جو کچھ بھی کھایا۔ حمام میں کھایا۔ تاکہ کوئی دیکھ کر تعجب نہ کرے کہ ایک صاحب بہادر بیٹھے پوریاں کھا رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ گھبراہٹ میں یا تو یہ پتے باہر پھینکنے بھول گئے یا انھوں نے پھینکے تھے اور وہ ہوا کے زور سے پھر الٹے اندر گھس آئے۔ خیر معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں اچھی کٹے گی۔

دوسرے دن صبح ساڑھے چھ بجے بمبئی پہونچ گئے۔ یہ تو اسباب سمٹوانے میں رہے اور میں کرائے کی موٹر لے بمبئی ہوٹل پہنچا۔ بیسیوں دفعہ وہاں ٹھہرا ہوں۔ سب سے ملاقات ہے۔ منیجر صاحب سے ملاقات کیا دوستی ہے۔ پہلے انہی سے ملا اور کہا "ایک صاحب آرہے ہیں۔ میرے کمرے کے برابر ہی ان کو کمرہ دینا اور ذرا ادھر ادھر جائیں تو مجھ کو اطلاع کر دیا کرنا اس وقت تو بس اتنا ہی سن لو باقی پھر کہونگا" خیر میں تو ان سے یہ کہہ کر

یا نہ کروں۔ پھر شاید خیال آیا کہ کہیں اوروں کے سامنے ہتک نہ ہو جائے۔ نہایت ڈانٹ کر "نو" (نہیں) کہہ دیا۔ گارڈ نے مجھے لاکر ٹکٹ دے دیا۔ اور ہمارے دوست اپنی کتاب کے سر رہے میں اٹھا کر تھوتھنہ دھویا۔ کپڑے پہنے، ذرا بھلا آدمی بنا۔ صاحب سے انگریزی میں پوچھا "آپ پان تو کھاتے نہ ہوں گے"، کہا "نہیں۔ اس سے دانت خراب ہو جاتے ہیں"۔ میں نے پوچھا "شاید ولایت کا قصد ہے"۔ کہنے لگے "نہیں۔ اس وقت تو صرف بمبئی تک جا رہا ہوں۔ میں نے کہا "بمبئی میں کچھ عرصے تک قیام رہے گا۔ فرمایا "نہیں صرف چار دن"۔ اس کے بعد ذرا کھلے اور خود سوال شروع کئے۔ پہلا ہی سوال مطلب کا تھا۔ کہنے لگے بمبئی بہت بری جگہ ہے کھانا اچھا نہیں ملتا۔ کوئی ہوٹل اچھا نہیں ہے"۔ میں نے کہا یہ تو فرمایئے۔ تاج محل ہوٹل کے متعلق کون کہہ سکتا ہے کہ وہاں آرام نہیں ملتا۔ وہاں خرچ ضرور زیادہ ہوتا ہے۔ کہنے لگے "اوہ خرچ کی پرواہ نہیں۔ ہم اینگلو انڈین کو پسند نہیں کرتے۔ ہم ایسی جگہ ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ جہاں سب ہندوستانی ہوں یا سب یورپین" بھلا ایسا موقع ملے اور میں ہاتھ سے جانے دوں۔ میں نے کہا بمبئی ہوٹل میں ٹھہریئے۔ وہاں آپ کو آرام بھی ملے گا۔ اور اینگلو انڈین بھی نظر نہ آئیں گے۔ میرا مطلب دوسرا ہی تھا۔ میں خود اسی ہوٹل میں ٹھہر رہا تھا سمجھا کہ یہ شیئر ساتھ رہا تو میرا مضمون پورا ہو جائے گا۔ وہ بھلا اس پیترے کو کیا سمجھتے۔ چٹ راضی ہو گئے۔ پھر میری ذات کے متعلق انہوں نے سوالات کی بھرمار شروع کر دی۔ "کیا نام ہے؟ کہاں پڑھا ہے؟ کہاں تک پڑھا ہے؟ کہاں نوکر ہو؟ کیا تنخواہ ملتی ہے؟ کتنے بچے؟ کیوں بمبئی

عادی نہیں۔ اس لئے بے ضرورت سامان سمیٹ لائے ہیں۔ ان خیالات کا دل میں آنا تھا کہ چٹ اٹھ بیٹھا۔ سوچا کہ چلو اللہ نے مفت کا ایک مضمون دیا۔ خدا کرے کچھ عرصہ ساتھ رہے۔ مزا آجائے گا۔ سب سے پہلے تو میں نے قلیوں کو سمجھایا کہ "بیوقوفو! کہیں صاحب لوگوں کے پاس لوٹا ہوتا ہے۔ جوان کے پاس ہوگا۔ چلو ہٹو، لوٹا پولیس میں دے دو، کوئی دوسرا مسافر چھوڑ گیا ہوگا۔" صاحب یہ سن کر مسکرائے اور "تھینک یو" سے میری عقل رسا کی داد دی۔ اس کے بعد نہایت فراغ دلی سے قلیوں کو انعام دیا۔ بے ترتیب سامان کو بلا وجہ ٹٹول ٹٹول کر اور بے ترتیب کر دیا۔ بندھا ہوا بستر ایک سیٹ پر رکھا۔ اور اس سے تکیہ لگا کر بیٹھے۔ اور اپنی کتاب "آداب مجلس" پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ میں نے پھر لمبی تانی، لیکن کن انکھیوں سے ان کو دیکھتا رہا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ لیا کرتے تھے کہ سو گیا یا جاگتا ہے۔ میں پہلے سے ان کو دھوکا دینے کے لئے تیار تھا کہ ان کا اصلی رنگ دیکھوں آہستہ آہستہ خراٹے لینے شروع کئے۔ وہ سمجھے کہ چلو یہ تو سو گیا۔ اب اپنا کام کرو۔ چپکے سے ٹفن باسکٹ کھولا۔ چھری کانٹے اور چمچے نکالے۔ کتاب کو دیکھ کر اسی کے موافق سامنے جمایا۔ اب تھوڑی دیر کتاب پڑھتے اور تھوڑی دیر خالی چھری کانٹے چلاتے۔ کبھی کبھی ایکٹروں کی طرح شکریے کے طور پر ادھر ادھر گردن بھی جھکاتے۔ غرض اسی طرح کوئی دو گھنٹے گزار دیئے۔ میں نے کروٹ لی اور انھوں نے آہستہ سے سامان ٹفن باسکٹ میں رکھ دیا۔ اسٹیشن آیا۔ گارڈ نے کھانے کے متعلق پوچھا۔ میں نے کھانے کے ٹکٹ کے روپے دے دیئے۔ انہوں نے صاحب بہادر سے بھی دریافت کیا۔ پہلے تو انہوں نے دماغ پر زور ڈالا کہ سبق پر عمل کروں

شیروانی اتاری۔ جوتا اتارا۔ جرابیں اتاریں۔ بچھونا بچھایا۔ پاندان کھول کر پان کھایا۔ بچھونے پر لیٹ تکیئے گھٹنوں میں دبا آرام سے لوٹ ماری۔

اس زمانے میں بعض ایڈیٹروں کے تقاضے نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا مضمون لکھوں پنسل اور کاغذ سرہانے رکھ لیا تھا کہ کچھ سوجھ جائے گا۔ تو لکھ لوں گا۔ مگر گاڑی کے چکروں میں کچھ ایسا مزہ آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ نیند تو ایسے مزے کی آئی تھی کہ شاید بمبئی ہی میں جا کر آنکھ کھلتی مگر کیا ایک "صاحب بہادر" کی کرخت آواز نے نیند میں خلل ڈال دیا آنکھیں تو میں نے نہیں کھولیں۔ ہاں ذرا بھیچی بھیچی آنکھوں سے گاڑی کا رنگ دیکھا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ فام سے آدمی نہایت عمدہ سوٹ پہنے منہ میں سگار دبائے قلیتوں سے انگریزی لہجے کی اردو میں لڑ رہے ہیں۔ لڑائی ایک ٹین کے لوٹے پر تھی۔ قلی کہتے تھے کہ "حضور کا ہے" صاحب کہتے تھے۔ "ہمارا نہیں ہو سکتا"۔ قلیتوں کو یہ شاید ڈر تھا کہ چوری کا الزام نہ لگ جائے۔ ورنہ ان کو جھگڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوٹا اٹھا کر چلتے بنتے۔ مگر میں سمجھ گیا کہ ان ہمارے ہندوستانی بھائی، کو انگریزیت کا نیا شوق چرایا ہے۔ گھر سے بیوی نے لوٹا ساتھ کر دیا ہوگا۔ یہاں سوٹ پہن کر لوٹا ساتھ رکھتے شرم آتی ہے، اس لئے اس کی ملکیت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ گھڑی گھڑی ان کا ہاتھ مونچھوں پر جاتا اور خالی آتا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ مونچھیں پہلی دفعہ منڈوائی گئی ہیں۔ رہ رہ کر ٹائی درست کرتے۔ کوٹ اور واسکوٹ کی سلوٹیں نکالتے۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ سوٹ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ ہاتھ میں موٹی سی آداب مجلس کی کتاب تھی۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ عالم ہو کر یہ کہیں عمل کرنے جا رہے ہیں۔ بکسوں کی زیادتی بتا رہی تھی کہ سفر کے

بعد ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ "ہندوستان میں علاج نہیں ہو سکتا۔" "جرمنی جاؤ" واپس آیا۔ پھر مشورے ہوئے سب نے کہا کہ "میاں جاؤ۔ آنکھوں سے زیادہ کہیں روپیہ ہے" مرتا کیا نہ کرتا۔ بنک کا حساب دیکھا۔ ٹکٹ کا انتظام کیا۔ چلنے کی تیاری کی۔ یار دوستوں سے رخصت ہونے لگا۔ ایک صاحب نے کہا "اجی حضرت! کیوں روپیہ تباہ کرتے ہو اگر ولایت جانے کا شوق ہے تو خیر اسی بہانے سے جاؤ۔ ہاں اگر بال بچوں کے لئے کچھ چھوڑ مرنا ہے، تو یہیں علاج کراؤ۔ ولایت والوں میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہے۔ ہم لوگ خود اپنے ہندوستانی بھائیوں کو ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ ورنہ جو وہ کر سکتے ہیں وہ ہم کر سکتے ہیں۔ ہاں وہ غیر سمجھ کر لوٹتے ہیں۔ ہم اپنا سمجھ کر ہمدردی کرتے ہیں۔ لو مجھے ہی دیکھ لو میری آنکھوں میں کیا رہا تھا۔ میں فرانس گیا نہ جرمنی۔ یہیں علاج کیا اور اچھا ہو گیا۔ اگر روپیہ سے دشمنی نہیں تو بھائی صاحب بمبئی جایئے ڈاکٹر ڈگن سے ملئے۔ اں دو جواب دے دیں تو آپ کو اختیار ہے۔

کچھ بات ہے جو انگلستان کے ماہران فن چشم نے اس کو اپنی کانفرنس کا صدر نشین بنایا تھا۔ ہمارا کام سمجھانا تھا۔ سمجھا دیا۔ اب تم جانو تمہارا کام جانے۔ مانو یا نہ مانو۔ میں نے بھی سوچا ہاں بھائی صاحب تو سچ کہتا ہے لاؤ۔ ڈاکٹر ڈگن کو بھی دیکھ لیں کہ کتنے پانی میں ہے۔ گھر آیا صبح ہی بستر باندھ ریل پر سوار ہو گیا۔ میں بیچارا ہندوستانی آدمی۔ سامان بھی کچھ واجبی ہی واجبی ساتھ تھا۔ لباس کے ساتھ پاندان اور لوٹا صاف ظاہر کرتا تھا کہ ممبر ایک کاقدامت پسند آدمی ہے۔ انگریزی جانتا ہوں۔ انگریزوں کے ساتھ مدتوں رہا ہوں۔ انگریزی کپڑے بھی پہنتا تھا مگر وہ زمانہ گیا۔ اب تو کچھ اپنے ہی ملک کے لباس میں آرام آتا ہے۔ سکندرہ کلاس میں بیٹھ ٹوپی اتاری۔

مرزا فرحت اللہ بیگ فرحت

صاحب بہادر

آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ مگر خدا بھلا کرے ہم ہندوستانیوں کا کہ اس نعمت کی کبھی قدر نہیں کرتے، سمجھتے ہیں کہ مفت کا مال جس طرح جی چاہے کام میں لاؤ۔ رات کو پڑھو۔ دن کو پڑھو۔ صبح کو پڑھو شام کو پڑھو یا تو اُن سے اتنا کام لو کہ بیکار ہو جائیں یا اس طرح چھوڑ دو کہ یہ خود نکمی ہو جائیں۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ خود میں نے ان کو تباہ کر لیا۔ جب دیکھو کتاب ہاتھ میں ہے، روشنی ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ اندھیرا ہے تو کچھ پرواہ نہیں۔ کتاب ہے اور میں ہوں آنکھیں کہاں تک کام دیتیں۔ کمزور ہونی شروع ہوئیں۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پڑھا۔ پھر آنکھیں دبا دبا کر پڑھا۔ آنسو آئے پونچھ لئے۔ ذرا دھندلا دکھائی دیا۔ دھو ڈالا۔ غرض جب ساری ترکیبیں ختم ہو گئیں۔ اور کتاب کے حرف نگاہ کے سامنے سے بھاگنے لگے۔ بھنگے سے اڑنے لگے۔ اس وقت خیال آیا کہ آنکھیں گئیں۔ اور گئی نہیں تو کمزور ضرور ہو گئیں۔ اب علاج کی سوجھی سب نے کہا کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ دوستوں سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مدراس جانے کی رائے دی۔ بستر باندھ مدراس پہنچے۔ آنکھوں کے مریضوں کا جو دواخانہ ہے۔ اس میں جا کر معائنہ کرایا۔ نیسیں بھریں، تین چار روز تک دیکھنے کے

مرزا فرحت اللہ بیگ فرحتؔ

فرحت ۱۸۸۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، ۱۹۰۵ء میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے بی اے پاس کیا پھر ایم اے کے امتحان میں بھی شریک ہوئے۔

فرحت ڈراموں کے اداکار، تیز اک، خوش نویس اور مصور تھے۔ یہ نمائش اور فیشن کے قائل نہ تھے۔

۱۹۰۷ء میں دہلی سے حیدرآباد آئے اور اونچے عہدوں پر فائز ہوئے۔

فرحت نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ حیدرآباد کی اردو مجلس انہی کی یادگار ہے۔ ان کا انتقال ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۹۴۷ء میں ہوا۔ یہ اپنے مضامین کے ذریعے اپنے معاشرے کی اصلاح کا مقصد رکھتے تھے، موجودہ مضمون میں نقالی کی برائیاں بڑے لطیف اور شوخیانہ انداز سے صاف اور رواں زبان میں پیش کی ہیں۔ ہنستے ہنستے تنقید کرنے کا اچھا انداز نکالا ہے۔ اس کے پڑھنے سے دل کو ایک خاص فرحت ہوتی ہے۔ اور نامعلوم طور پر اصلاح بھی ہوتی جاتی ہے۔

تھی جو دُنیا کی کسی تتلی کے پروں میں نہ تھی وہ یہ کہ اس کے پروں سے گلاب کی بھینی بھینی خوشبو نکلتی تھی۔ جیسے گلاب کا عطر لگا رکھا ہو۔

تتلی نے دل میں سمجھا رات ضرور پریوں کی نیک دل ملکہ کا ادھر سے گزر ہوا ہے۔ اسے چوں کہ اپنی مخلوق کے دل کا حال معلوم ہو جاتا ہے، اس لئے اسے میرے غم کی وجہ معلوم ہو گئی۔ اور اسی نے مجھے حسین بنا دیا۔

تتلی کی خوشی کا اب کیا ٹھکانا تھا۔ وہ شاخ سے باہر نکلی اور اپنے خوبصورت پروں کو ہلا ہلا کر اُڑنے لگی۔ سب سے پہلے اسے اپنے دوست گلاب کے پھول کا خیال آیا۔ اور وہ ناز و ادا سے اُڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔

لیکن اب پھول کہاں تھا۔ رات ہی رات میں اس کی حالت ایسی بدل گئی تھی کہ دیکھ کر گمان نہ ہوتا تھا کہ وہ کبھی تازہ اور حسین بھی ہوگا۔ وہی پھول جس کی سُرخی کبھی کبوتر کے خون کو شرماتی تھی۔ اب مرجھا کر ایسے پھیکے رنگ کا نظر آ رہا تھا۔ گویا کئی دنوں کا باسی پھول ہے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر تتلی کو بڑا اچنبھا ہوا اور کچھ دیر بعد بولی "پیارے گلاب ننھے گلاب تمہیں کیا ہو گیا؟"۔

پھول میں جواب دینے کی سکت نہ تھی، تتلی نے پھر کہا "پیارے گلاب، ننھے گلاب ادھر دیکھو" پھول نے کوئی جواب نہ دیا۔ اچانک تتلی کے ذہن میں ایک بات آئی اور اپنے دل میں کہنے لگی "یہ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ کہیں یہ میرا حسن و جمال دیکھ کر جل تو نہیں گیا"۔ یہ کہا اور اپنے خوشنما پر ہوا میں لہراتی، اٹھکیلیاں کرتی باغ کے اسی حصے کی طرف چل دی جس طرف حسین تتلیوں کا جھرمٹ گیا تھا جہاں چہل پہل گھما گھمی تھی۔ رنگا رنگ اور قسم قسم کے پھول گملوں میں لگے تھے۔ اور سنگِ مرمر کے حوض میں لال لال خوبصورت مچھلیاں تیرتی تھیں۔

سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ مگر گلاب کے پھول کو نیند کہاں۔ وہ اپنی دوست کے غم کا راز سمجھ گیا تھا۔ اور دل ہی دل میں ایسی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ جس سے تتلی حسین بن جائے۔

آدھی رات گزر گئی مگر پھول اب بھی سوچ رہا تھا۔ یکایک ایک تجویز اس کے ذہن میں آئی مگر وہ ایسی خوفناک تھی کہ اس کی پتی پتی کانپ اٹھی آخر اس نے دل مضبوط کیا اور اس تجویز پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

اس نے جھک کر تتلی کی طرف دیکھا وہ اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر شاخ کے ہرے پتوں میں بے خبر سو رہی تھی۔ پھول نے اپنا سارا زور لگا کر اپنی پتیوں کو سکیڑنا اور ان کی نازک رگوں سے سرخ رس جو گویا پھول کا خون تھا کھینچنا شروع کیا۔ اس عمل سے پھول کو کس قدر تکلیف ہوئی اس کا اندازہ تم نہیں کر سکتے۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھا کیونکہ یہ سب تکلیف اپنی دوست کو خوش کرنے کے لئے اٹھا رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں پھول کی کٹوری سے خون کے سرخ سرخ قطرے اس جگہ ٹپکنے لگے۔ جہاں تتلی اپنی بدصورتی کا غمناک خواب دیکھ رہی تھی۔ رات بھر گلاب کے پھول کے خون کے یہ سرخ سرخ قطرے تتلی کے سفید بھدے پروں پر گرتے اور ان میں جذب ہوتے رہے اور پھول خون نکل جانے کے باعث لحظہ بہ لحظہ کمزور ہوتا گیا۔ صبح کو سورج کی پہلی کرن پڑتے ہی تتلی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی نظر جونہی اپنے پروں پر پڑی۔ اس کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی۔ اب اس کے پر ان تتلیوں پروں سے بھی زیادہ خوشنما تھے جو ایک دن پہلے ادھر سے گزری تھیں۔ سفید سفید پروں پر سرخ سرخ چتیاں یوں چمک رہی تھیں۔ گویا تتلی کے پروں پر ننھے ننھے لال ٹکے ہوں۔ ایک بات اس کے پروں میں ایسی

خوشنما چنتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ تتلی خوبصورتی میں ان کی گرد کو بھی نہ پہنچتی تھی۔ اس کے پر نازک تو تھے۔ مگر ان کا رنگ نہ تو سرخ تھا نہ نیلا اور نہ ارغوانی وہ سفید تھے۔ اور بس۔

تتلی اور گلاب کا پھول بڑی حیرانی سے انھیں دیکھنے لگے۔

یہ جھرمٹ باغ کے اس کونے میں صرف پل کیلئے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ تتلیوں کو شاید باغ کا یہ ویران کونا پسند نہ آیا۔ اور انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہاں ہمارے حسن کو پرکھنے والا تو کوئی ہے نہیں۔ یہاں کیا ٹھہرنا باغ کے اس حصے کا رُخ کیا۔ جہاں چہل پہل اور گھما گھمی تھی۔ رنگا رنگ اور قسم قسم کے پھول کھلے تھے۔ سنگ مرمر کا حوض تھا وہ چاہتی تھیں کہ اس کے شفاف پانی میں اپنا عکس دیکھیں۔ اور حوض کی لال لال خوبصورت مچھلیوں سے باتیں کریں۔

ان تتلیوں کے اِدھر آجانے سے ان دونوں کی زندگی جیسے یک بیک بدل سی گئی۔ اب وہ پہلے کی طرح خوش نہ رہتے۔ تتلی کو آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دُنیا میں اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر حسین تتلیاں موجود ہیں اور اس کا دل ٹوٹ گیا اِدھر گلاب کا پھول اپنی دوست کو غمگین دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھنے لگا۔ آج تتلی نہ پہلے کی طرح گلاب کے اردگرد ناچی نہ اس کی پتیوں پر بیٹھ کر رس پیا دن بھر دونوں چپ چپ رہے۔ آخر دن تمام ہوا۔ اور چاروں طرف شام کا اندھیرا پھیلنے لگا۔ تتلی ہمیشہ گلاب کے پھول کی گود میں سویا کرتی تھی۔ مگر آج وہ اس کی شاخ کے ان پتوں میں جن میں کانٹے ہی کانٹے تھے۔ منہ چھپا کر پڑ رہی معلوم ہوتا تھا کہ اپنی بدصورتی کی وجہ سے گلاب کے پھول سے دور رہنا چاہتی ہے۔

رات ہوئی پرندوں کے چہچہے تھم گئے۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ جگنو روشنیاں لے کر باغ میں چوکیداری کرنے لگے۔ سب چرند اور پرند

غلام عباس

تتلی اور گلاب

ایک تھی تتلی اور ایک تھا گلاب کا پھول۔ دونوں باغ کے ایک کونے میں الگ تھلگ رہتے تھے۔

تتلی گلاب کے پھول کو اپنا سہانا ناچ دکھاتی اور گلاب اسے دیکھ دیکھ کے جھومتا۔ اور مارے خوشی کے اپنی ساری پتیاں کھول دیتا کہ تتلی جتنا چاہے چوس لے۔ دونوں میں دوستی تھی اور وہ اپنی چند روزہ زندگی خوش خوش گزار رہے تھے۔

باغ کے جس حصے میں یہ دونوں رہتے تھے وہاں ایسا بے رونق تھا کہ تتلیاں اور بھونرے ادھر کبھی رخ نہ کرتے تھے۔ وہاں گلاب کا صرف ایک ہی پیڑ تھا۔ اس میں تو کلیاں کئی تھیں مگر پھول یہی ایک کھلا تھا۔ چنانچہ تتلی گلاب کے پھول کو دنیا کا سب سے حسین پھول سمجھتی تھی۔ اور گلاب کا پھول تتلی کو دنیا کی سب سے حسین تتلی۔ دونوں کی زندگی بڑے امن و چین سے گزرتی تھی۔

ایک دن اتفاق سے تتلیوں کا ایک جھرمٹ ادھر آ نکلا۔ وہ سب کی سب حسین تھیں۔ اُن کے پر رنگ برنگے اور نازک تھے۔ اور ان پر نہایت

غلام عباس

پنجاب کے افسانہ نگار ہیں۔ دہلی میں بھی ان کا قیام رہا ہے۔ یہ آواز کے ایڈیٹر تھے۔ اپنی تصانیف سے اردو ادب میں گراں قدر اضافے کئے ہیں۔ رسالہ نقوش شخصیات نمبر میں ہے کہ "کبھی بارہ گھر ہی سے تہیہ کر کے آتے ہیں کہ ان کے کلام سے ان کی بزرگی اور وقار ظاہر ہو لیکن آپ اپنے دل میں ان کے لئے عزت سے زیادہ پیار کا جذبہ لے کے آئیں گے۔"

تتلی اور گلاب میں بھی عزت سے زیادہ پیار کا جذبہ ہی ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے وقت نظر کا ثبوت دیا ہے اور ایثار کے جذبے کی بڑی اچھی وضاحت کی ہے۔ دوست کی خوش نودی کیلئے اپنا سب کچھ تج دینا قابل قدر ہے۔

رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے۔ تخیلی افسانے کا یہ عالم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار قاری کو اپنی خیالی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔ جسے اس کا ذہن تخلیق کرتا ہے۔

افسانے تعمیری بھی ہوتے ہیں اور تخریبی بھی، تفریحی افسانے ان دونوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ تخریبی افسانے وہ ہوتے ہیں جن میں اخلاقیت نہیں ہوتی۔ اور جو افادیت سے بھی خالی ہوتے ہیں۔ وہ بیمار ادب کے سوا اور کچھ نہیں۔ افسانے کا عنوان بھی اہمیت رکھتا ہے، عنوان پھبتا ہوا اور کھلتا ہوا ہونا چاہیئے۔ ایسا دلکش ہونا چاہیئے کہ قاری کے دل میں افسانہ پڑھنے کی خواہش پیدا ہو جائے، نہ اتنا دلچسپ نہ اتنا مبہم۔

یہ مجموعہ جامعہ میسور کی پری یونیورسٹی جماعت کے معیار کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے تین افسانے ڈاکٹر آمنہ خاتون صاحبہ کے مرتبہ ہیں اور باقی چھے ڈاکٹر رضی الدین احمد صاحب اور میر محمود حسین صاحب نے مرتب کئے ہیں۔

امید ہے کہ اس مجموعے کو اساتذہ کرام اور طلبہ اور طالبات پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

میر محمود حسین

جاتا ہے یا اُس کی طرف ہلکا سا اشارہ کر دیا جاتا ہے، گویا افسانہ نگار قاری کے فہم کا اعتراف اور اعتبار کرتا ہے یہ بھی ایک خوبی ہے اور اس سے قاری کی مسرت اور ذوق میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

افسانے میں کردار نگاری کا کام عموماً عمل اور مکالمے سے لیا جاتا ہے۔ اس کا بیان ایک عیب ہے۔ افسانہ نگار اپنے کردار ہی سے ایسا عمل کراتا اور اس کی زبان سے ایسی باتیں نکلواتا ہے۔ جو اُسے اس کے اصلی رنگ روپ میں ظاہر کر دیتی ہیں۔ افسانہ نگار اسے راست قاری کے سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔ خود دونوں کے بیچ میں کھڑا نہیں ہو جاتا فنی لحاظ سے بعض افسانوں میں پلاٹ، کردار اور ماحول کا مقام یکساں اور مساوی ہوتا ہے بعض میں ساری اہمیت کردار ہی کو دی جاتی ہے اور پلاٹ اور ماحول ضمنی ہوتے ہیں۔ بعض میں ماحول ہی مقصود ہوتا ہے۔ اور بعض افسانوں میں پلاٹ ہی اہم ہوتا ہے جیسے سراغ رسانی کے افسانے ہوتے ہیں۔

مختصر افسانے کا ایک مقصد ہوتا ہے، افسانہ نگار کچھ کہنا، سمجھانا اور منوانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مرکزی خیال کو افسانے کے پردے میں پیش کرتا ہے اور غیر محسوس طور پر قاری کو اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے۔ یہی تاثر اس کا مقصد ہوتی ہے۔ اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے۔ افسانہ خیالات کی تبلیغ کا کامیاب ترین ذریعہ ہے۔ زندگی جتنی متنوع اور رنگا رنگ ہے افسانے بھی اتنے ہی متنوع ہوتے ہیں۔ اچھے افسانے زندگی کی پر اثر ترجمانی کرتے ہیں حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور اصلاح و ترقی کی راہ میں دکھاتے ہیں مرکزی خیال کا جو رنگ ہوتا ہے۔ وہی سارے افسانے پر چھایا ہوا ہوتا ہے حزنیہ افسانے کا ہر جزو غم آلود ہوتا ہے۔ مزاحیہ افسانے کی ہر بات مزاح کے

صحت اور فطرت لازمی ہوتی ہے، البتہ رنگینیٔ بیان سے لذت اور لطف میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تصویر کے لئے پس منظر کی ضرورت ہوتی ہے اور ڈراما کے لئے مناظر کی، ۔ افسانے میں یہی حیثیت ماحول کی ہوتی ہے، لیکن یہاں ماحول پلاٹ کا ماتحت ہوتا ہے، ایک اچھے افسانے میں پلاٹ کے ماحول کی وہی حیثیت ہوتی ہے جو زیور یا انگشتری میں جڑے ہوئے جواہرات کی، ماحول سے فضا بنتی اور کیفیت پیدا ہوتی ہے، ماحول کا بیان کیا جاتا ہے اور اس کا بیان گویا ایک طرح کی مصوری ہے۔ افسانہ نگار یہاں بھی اپنا کمال دکھاتا ہے۔ اور ماحول سے پلاٹ کا حسن اسی طرح دوبالا کر دیتا ہے جس طرح جوہری جواہرات کا حسن زیور سے بڑھا دیتا ہے۔

کسی زمانے میں افسانوں کا محبوب اور مقبول آغاز تھا جو اب قدیانوسی بن چکا ہے۔ فنی لحاظ سے افسانے کا آغاز یا افتتاح بھی اس کی کامیابی کا ایک اہم عنصر ہے، انگریزی کی کہاوت ہے "اچھا آغاز گویا آدھی تکمیل ہے"۔ مثلاً تاریخی افسانوں میں آغاز وسط سے ہوتا ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ قاری اصل مسئلے پر بہت جلد راست پہنچ جاتا ہے، آغاز ہی قاری کی توجہ اور ذوق پر قابو پانے کا مقام ہے۔ اس لئے اسے بہت ٹھوس، پختہ پرزور اور برمحل ہونا چاہیئے۔ معمولی یا سست آغاز افسانے کو قاری کی نظر سے پہلے ہی گرا دیتا ہے ڈرامے کا آغاز عموماً تعارفی ہوتا ہے۔ لیکن افسانے کا آغاز کو تعارف کے ساتھ ہی ساتھ نقطۂ عروج کو پیش گوئی کا حق بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔ بعض افسانوں کا آغاز کردار یا مسئلے کے تعارف سے ہوتا ہے، بعض اوقات ایک عام کلیدی حقیقت کے بیان سے افسانہ شروع ہوتا ہے لیکن جس قسم کا آغاز بھی ہو اسے نہایت مختصر اور چست ہونا چاہیئے، بعض حالات اور واقعات کا مبہم سا بیان کیا

اشخاص، واقعات، جذبات، اور حالات وغیرہ سب ضمنی ہوتے ہیں۔ عشقیہ افسانوں میں عاشق اور معشوق دو کردار ضرور ہوتے ہیں، لیکن افسانہ نگار کا مقصود ان دونوں میں سے ایک ہی ہوتا ہے اور اس کی ہمدردیاں ایک ہی کردار سے وابستہ ہوتی ہیں۔

پلاٹ مختصر افسانے کا گویا ڈھانچہ ہوتا ہے، حالت اور واقعات کی ترتیب کو پلاٹ کہتے ہیں۔ اور اُن کے تسلسل کو پلاٹ کا ارتقا کہا جاتا ہے۔ ایک اچھے افسانے کا پلاٹ سیدھا سادہ ہوتا ہے، پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اصلی اور فطری ہوتا ہے۔ ورنہ قاری کو یقین نہیں آئے گا۔ پلاٹ ایک بات سے شروع ہوتا ہے، چند واقعات، اور حالات سے گزرتا ہے جو اس کے رنگ کو چوکھا کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ نقطۂ عروج یا نقطۂ کمال پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ اول سے آخر تک اس میں کشمکش نزاع اور تصادم کا رنگ چھایا ہوا رہتا ہے، جو یا تو خیالات سے متعلق ہوتے ہیں، یا مقاصد سے، افسانے کی کامیابی کا دارومدار بڑی حد تک نقطۂ عروج پر ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعے افسانہ نگار اپنا مرکزی خیال قاری کے ذہن میں یقین کے ساتھ جاگزیں کر دیتا ہے۔

مختصر افسانے کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ مختصر ہوتا ہے وہ اتنا مختصر ہوتا ہے کہ اور مختصر نہ ہو سکے، اس میں اہم اور لازمی باتوں کا بیان ہوتا ہے جن کا تعلق مرکزی خیال سے ہو، بیان برائے بیان نہ ہو، بلکہ ہر لفظ، ہر فقرہ، ہر جملہ اور بیان ضروری ہو حالات اور واقعات کی کوئی غیر ضروری تفصیل بیان نہ کی جائے فقط چند حالات یا واقعات یا مناظر کے مجموعے کو مختصر افسانہ نہیں کہتے، بلکہ یہ ان کی فنکارانہ ترتیب کا نام ہوتا ہے، جس سے نقطۂ عروج تک ارتقا اور رسائی ہو سکے۔ اور یہ سب نہایت اختصار کے ساتھ پُر اثر انداز میں بیان کیے جائیں تاکہ قاری کے ذہن میں ذوق بھی پیدا ہو جائے۔ اور اثر بھی، بیان میں

تعارف!

قصے کہانیاں سُننے کا شوق انسانی فطرت میں رچا ہُوا ہے، اور اس کا رواج، عالمِ انسانی کے آغاز سے چلا ہے، پہلے افسانے سُنائے جاتے تھے بعد کو لکھے اور پڑھے جانے لگے۔ پہلے عموماً منظوم ہوتے تھے، پھر نثر میں لکھے جانے لگے، اور آج ادب کی کوئی صنف افسانے سے زیادہ عام اور مقبول نہیں رہی۔ ادب کی اہم ترین صنف ہے۔ اور ادب کے مقصد کی تکمیل کا بہترین ذریعہ ثابت ہو رہا ہے۔

مختصر افسانہ ایک فنی چیز ہے، فقط ایک قصہ نہیں جو مختصر ہو اس کے چند بنیادی اصول ہیں۔ اور کچھ خصوصیات۔ اس کا ایک آغاز ہوتا ہے۔ اور ایک پلاٹ، اس میں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے۔ اور ایک خاص ماحول، اس میں کشمکش یا نزاع ہوتی ہے۔ اور ایک نقطۂ عروج یا نقطۂ کمال بھی ہوتا ہے۔ یہ سب مختصر افسانے کے گویا اجزاءِ ترکیبی ہوتے ہیں۔ مرکزی خیال مختصر افسانے کی بنیاد ہوتا ہے۔ افسانہ نگار کا ذہن اس کیلئے مرکزی کردار، ماحول، پلاٹ، نزاع اور نقطۂ عروج وغیرہ دوسرے سارے عناصر پیدا کر لیتا ہے، سارا افسانہ مرکزی خیال کے محور پر گھومتا ہے۔

مختصر افسانے کی ایک بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ آغاز ہی سے قاری کے ذوق کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، اور اس میں گہرائی پیدا کرتا چلا جاتا ہے مرکزی خیال گویا مختصر افسانے کا دل ہوتا ہے، وہ جتنا موثر ہوگا افسانہ اتنا ہی جاندار ہوگا وحدت کو مختصر افسانے کی روح کہنا چاہیئے۔ مرکزی خیال میں بھی وحدت ہوتی ہے، کردار میں بھی اور اس سے اثر میں وحدت پیدا ہوتی ہے۔ قاری کے تاثر میں وحدت مختصر افسانے کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ کہانی ایک ہی شخص کی ہو، واقعہ بھی ایک ہی، جذبہ بھی ایک ہی اور افسانہ نگار بات بھی ایک ہی کہنا چاہتا ہو، قاری کے دل پر اثر بھی ایک ہی بات کا پڑے۔ باقی

849
0169.3
.N71

اَفسانے

۱۔ تتلی اور گلاب	غلام عباس ۔	۸
۲۔ صاحب بہادر	مرزا فرحت اللہ بیگ فرحت ۔	۱۳
۳۔ چچا چھکن نے ایک بات سُنی	سیّد امتیاز علی تاج ۔	۳۸
۴۔ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ	سیّد سجاد حیدر یلدرم ۔	۴۴
۵۔ پروفیسر دانش	کنھیا لال کپور ۔	۶۰
۶۔ منتر	پریم چند ۔	۶۹
۷۔ موبی	کرشن چندر ۔	۸۸
۸۔ بخومی اور ٹیپو سلطان رح	محمود خان محمود بنگلوری ۔	۱۲۴
۹۔ دربار	شوکت تھانوی	۱۲۹

اگست سنہ ۱۹۷۱ء

کوثر پریس، بنگلور

T. MUNTAQAB AFSANA
A. DR. Razi uddin
Dr. Ameena Khatoon.
S. Fiction.
Date - 1971
Price - Rs. 3/-

منتخب افسانے

R.B.A.N.M.'s High School (Main) LIBRARY
ACC. No 7106
CLASS No.
Date 27/8/97

ڈاکٹر رضی الدین احمد
ایم اے، پی ایچ ڈی
صدر شعبہ اردو، فارسی، و عربی
ایس وی یونیورسٹی، تروپتی

ڈاکٹر آمنہ خاتون
ایم اے پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو و فارسی
مہارانی کالج بنگلور

میر محمود حسین ایم اے
لکچرر فارسی، شعبۂ اردو، مانسا گنگوتری
جامعہ میسور

ناشر
اردو لائبریری سنٹر پوسٹ بکس نمبر 6657 بنگلور ۲
نمبر 37 سٹی مارکٹ
قیمت 3/00

R. 2 50 P.

مینیجر افسانے

K.B.A.N.M.'s High School (Main)
LIBRARY

ناشر
اردو لائبریری سنٹر
سٹی مارکٹ، بنگلور ۲
پوسٹ بکس نمبر 557